

نی میں کملی آں

”پارو! اور کہیں تک کر بیٹھ جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا اور وہ کسی کا انتظار بھی کرے ناممکن! اور اس پہ ایک اور قیامت کہ وہ اپنی بھوک اور نیند بھی برداشت کرے..... تو یہ کبھی قصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔“

پارو کے مزاج آشنا پارو کے بارے میں ایسے ہی گماں رکھتے تھے مگر آج ان کے خیال کے برعکس وہ متواتر چار گھنٹوں سے ایک ہی جگہ بیٹھی ہوئی تھی اور انتظار بھی کر رہی تھی اس پہ تیسری قیامت یہ کہ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی پھر بھی وہ برداشت کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اس کا کوئی مزاج آشنا دیکھ لیتا تو یقیناً غش کھا جاتا اور سب سے پہلے یہی سوچتا کہ ایسی کوئی بات ہو گئی ہے جس نے پارو جیسی ”اقری“ اور بے لگام چیز کو لگام ڈال دی ہے لیکن کوئی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ پارو کی آنکھوں کے سامنے اس وقت بھی اپنی ماں کے جڑے ہوئے ہاتھ لہرا رہے ہیں اور التجائیہ آنسو بہہ رہے ہیں جو اسے برداشت کرنے پر مجبور کر رہے تھے ورنہ دنیا کی ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جو اسے اس طرح مجسمہ بن کر بیٹھنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ ورنہ تو وہ کب کی اپنی من مانی کر کے اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلا چکی ہوتی۔

اسے بھاری کامدار لپٹے اور زبورات سے وحشت ہو رہی تھی اس پہ میک اپ سے الجھن کا احساس مزید طبیعت کو بے زار کر رہا تھا مگر وہ اسے بے زاری کے باوجود رات کی اس پہر بھی صبر و ضبط کئے بیٹھی اپنی فطرت کے خلاف ریکارڈ توڑ رہی تھی اور جس شخص کے لئے ایسا کیا جا رہا تھا وہ ابھی تک کمرے میں تشریف نہیں لایا تھا اور ابھی بھی دو در ورتک کوئی آثار نہیں تھے۔ پارو اپنے سرکش دل کو الٹی سیدھی باتیں سوچنے سے باز رکھتی اپنی ہی کلائی میں کھنکھکتی چوڑیوں کو انگلیوں سے چھیڑ رہی تھی کہ اسے آہٹ کا احساس ہوا اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا مگر دروازہ ابھی بھی بند تھا یہ آہٹ اس کا وہم تھی اس نے ایک بار پھر مایوس ہو کر چہرہ جھکا لیا۔

مایوسی اسے اس کے نہ آنے سے نہیں ہو رہی تھی مایوسی اسے اپنی حالت پہ ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنا حلیہ تبدیل کرنا چاہتی تھی اپنے آپ کو آزادی دلانا چاہتی تھی اور جب تک وہ نہ آتا بقول بڑی آپا کے اسی طریقے اور انداز میں رہنا تھا۔

”ملک صاحب شکر ادا کرو کہ پارو آج مجبور ہے ورنہ.....“ وہ مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑائی اور آخری لفظ کو ذرا لمبا بھینچ کر لب بھی بھینچ لئے تھے۔ پارو کے اندر غصے کا زہر بھر رہا تھا وہ بل کھا رہی تھی اور ایک عجیب سی آگ تھی جو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سلگنے پہ مجبور کر رہی تھی اس سے پہلے کہ سلگنے کے بعد شعلوں کا عمل شروع ہوتا دروازہ کھولا گیا اور چند سیکنڈز بعد بند کر دیا گیا۔ قدموں کی چاپ سے آنے والی ہستی کی سرد مہری کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ دو منٹ کے وقفے سے دوسری سرد مہری کا مظاہرہ ہوا.....

”کیا دن بھر دلہن بننے کا شوق پورا نہیں ہوا جو رات کے تین بجے بھی اتنے ذوق و شوق سے تیار بیٹھی ہو؟“

پارو ایک دم تڑپ کر کہنے لگی یہ سرد مہری نہیں زہر میں بجھا ہوا حقارت آمیز نشتر تھا جو وہ اس کے وجود میں اتار چکا تھا تکلیف تو ہونا ہی تھی اسی تکلیف کے باعث اس نے براہ راست گردن موڑ کر ملک آڑ میر حیات کو دیکھا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھ کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔

”آپ کو شاید اندازہ نہیں ملک صاحب کچھ مجبوریاں دیکھنے والوں کو شوق نظر آتی ہیں لیکن وہ شوق نہیں ہوتیں مجبوریاں ہی ہوتی ہیں۔“
اُدھار رکھنا اسے بھی نہیں آتا تھا کھڑے کھڑے حساب چکاتی تھی۔

”اس کمرے سے باہر تو مجبوری کا بہانہ مان سکتا ہوں لیکن اندر ایسی کون سی مجبوری تھی جس نے تمہیں ابھی تک باندھ رکھا ہے؟“ ملک آڑ میر کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ پارو کے تلوے سے لگی اور سر پہ بھی تھی اس نے تمل کر رخ اس کی سمت پھیرا۔

”پارو میرے جڑے ہاتھوں کی لالچ رکھنا کوئی کچھ بھی کہے تجھے ہر حال میں چپ رہنا ہے دیکھ ماں باپ کی عزت اب تیرے ہاتھ میں ہے دوسرے پنڈ جا کر ہمارے سر پہ خاک نہ ڈالو نا ہم پہلے ہی.....“

پارو کی زباں پہ آئے جلتے سنگتے تیز الفاظ یکدم سرد پڑ گئے ماں کی التجائیں دوبارہ کانوں میں گونجنے لگیں اور مرحوم باپ کی عزت کا خیال آتے ہی اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا کیونکہ انہیں وہ پہلے ہی ایک دھچکا لگ چکا تھا۔

”میں لائٹ آف کر رہا ہوں اگر صبح تک اسی طرح بیٹھنے کا ارادہ ہے تو صوفے پہ چلی جاؤ۔“ اس نے چونک کر دیکھا وہ سگریٹ ختم کر کے کپڑے بھی بدل چکا تھا اور بیڈ پہ اس کے قریب بیٹھا اسے اٹھنے کا اور اپنا ساز و سامان اتارنے کا سنگٹل دے رہا تھا پارو نے آج ہر داشت کا عہد کیا تو اسے نبھانا بھی تھا، سوخا موٹی سے اٹھ کر کمرے کے ساتھ بنے ایک چھوٹے کمرے میں آگئی جہاں اس نے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔

کافی دیر بعد وہ واپس کمرے میں آئی تو کمرے میں ملگجاسا اندھیرا پھیل چکا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ کیونکہ اسے جو کچھ سمجھایا گیا تو وہ کچھ اور تھا اور جو اس وقت ہو رہا تھا وہ کچھ اور تھا اور اس کچھ اور کے متعلق تو کسی نے کوئی ہدایت ہی نہ دی تھی نہ ہی ایسی صورت حال کے لئے اسے تیار کیا گیا تھا بلکہ کبھی کا یہی خیال تھا کہ ملک آڑ میر اسے دلہن بنے دیکھے گا تو دل و جاں سے فدا ہو جائے گا دیوانہ ہو جائے گا لیکن وہ دیوانہ تو نہیں البتہ بیگانہ ضرور ہو گیا تھا۔

”وہ کمرے کے پتھوں بیچ کھڑی فیصلہ نہیں کر پار ہی تھی کہ اسے کس سمت مڑنا چاہئے صوفے کی سمت یا پھر بیڈ کی سمت؟ اتنی دیر سوچ بچار کے بعد اس کے قدم صوفے کی سمت اٹھ گئے اسے اس کے پہلو میں جانا گوارا نہیں تھا اور وہ ریلیکس ہو کر سونے کی تیاری کرنے لگا تھا۔



”اری پارو یہ تو بتا رہی تھی میں کیا ملا؟“ وہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا جب پارو کی کسی سہیلی کا پر شوق جملہ ان کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا اور اسی وقت اس نے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی پارو کو دیکھا اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر معنی خیزی لڑکیاں معنی سے ہنستی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئیں وہ صبح سے نکلا ہوا تھا اس وقت نہا کر کپڑے تبدیل کرنے آیا تھا انتہائی میسر آتے ہی وہ الماری کی سمت بڑھا اور پھر اس کے قریب آ گیا۔

”یہ تمہارا رونمائی کا تھہ ہے کل اماں نے دیا تھا مجھے نہیں پتہ کہ اس میں کیا ہے میں رات کو دینا بھول گیا تھا آتم سوری.....“ پیکٹ بیڈ پر اس کے سامنے تقریباً پٹختے والے انداز میں رکھا گیا تھا اور ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ اماں نے دیا ہے میری طرف سے مت سمجھنا..... اور وہ چپ چاپ بیٹھی بس دیکھتی رہی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور ملک آثمیر اس کی مسلسل خاموشی سے حیرت میں غرق ہو رہا تھا کیونکہ جو کچھ بچپن سے پارو کے بارے میں جانتا تھا یا پھر جیسا لوگ پارو کے بارے میں اظہار کرتے تھے وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر رہی تھی حالانکہ وہ چاہتا تھا کہ پارو کوئی ”ڈنگل“ چائے تاکہ اماں کو اپنی لاڈلی بھانجی کے کرتوت تھوڑا دھچکا تو لگاتے مگر پارو تو جیسے ڈنگل کرنا ہی چھوڑ چکی تھی اور وہ مایوس ہو رہا تھا۔

”پارو پتر ناشتا آچکا ہے اندر بھیج دیں؟“ اماں نے دستک دی تو دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے جھانک کر اسے بھی دیکھ لیا لیکن آثمیر کو ڈرینگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر اندر آ گئیں۔

”تم بھی آچکے ہو؟ چلو اچھا ہوا ناشتا تو اکٹھے ہی کرنا تھا بیٹھو تم دونوں میں بھیجتی ہوں، صفیہ آتی ہے ناشتا لے کر۔“ آثمیر کو موجود دیکھ کر انہیں مزید تسلی ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد صفیہ آپاں کا ناشتا لے کر آئیں اور ٹیبل پر سجا کر باہر نکل گئیں۔ پاروان سے کافی نارمل بلکہ سرسری انداز میں ملی تھی وہ اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ خاموشی سے کھانا کھایا گیا اور وہ بھی اٹھ کر چلا گیا اس کے بعد لڑکیوں کا جھرمٹ تھا اور طرح طرح کی عورتیں تھیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے پورا گاؤں اس کے کمرے میں سمٹ آیا ہو عورتیں اشتیاق سے ملک آثمیر حیات کی ”ووہٹی“ دیکھنے آ رہی تھیں اور سب ہی کو ووہٹی پسند بھی آتی تھی مگر کچھ نظریں ایسی بھی تھیں جن میں ووہٹی کا رنگ و روپ تیر کی طرح چمکا تھا انہیں ملک آثمیر حیات کی ووہٹی ذرا بھی نہ بھائی تھی اور یہ ان کے اندر کے حسد اور جلن کا نتیجہ تھا ورنہ پارو سادگی میں بھی کسی جگہ ٹھہر جاتی تو وہ جگہ ج جاتی تھی۔

”پارو یہ ماہین ہے چچا قدر کی بڑی بیٹی۔“ ساجدہ آپا نے آگے بڑھ کے تعارف کروایا تھا اور ماہین نے چھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ پارو کے مہندی رچے دو دھیا ہاتھ میں ماہین کا ہاتھ بہت حد تک ستولا گیا تھا حالانکہ ماہین کو اپنی گوری چڑی یہ بڑا ناز ہوتا تھا۔

”ساجدہ آپا! یہ آثمیر کی اب آخری شادی ہے نا؟ کہیں یہ نہ ہو کہ پھر چھ ماہ بعد نئی شادی کی خبر مل جائے۔“

پارو سے ہاتھ ملا کر ماہین نے ساجدہ آپا کو مخاطب کیا اور اس کی بات پہ جہاں ساجدہ آپا خشکیں وہیں پارو بھی لب بھینچ کر رخ موڑ گئی تھی۔

”کیسی باتیں کرتی ہو ماہین وہ کون سا آٹھ دس شادیاں کر چکا ہے جو تم ایسا کہہ رہی ہو۔“ ساجدہ آپا کو غصہ تو آیا مگر کیا کرتیں آخر وہ چچا زاد تھی اور موقع بھی کچھ نازک تھا اس لئے فی الوقت انہیں خاموش ہونا پڑا تھا پھر ماہین کو رخصت کر کے وہ پارو کے قریب آ گئیں۔

”دیکھو! یہ لوگ ہماری ذرا ذرا سی خوشی سے جل اٹھتے ہیں اور ہمیشہ فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، تمہیں ان کی باتوں پہ دھیان دینے کی کوئی ضرورت نہیں انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا یہ گھر بھی تمہارا اپنا ہے اور اس میں رہنے والے فرد بھی تمہارے اپنے ہیں اور اپنی چیز سے بدظن نہیں ہوتے ہم نے بڑی مشکلوں سے تجھے بیاہا ہے میری جان خیال رکھنا کسی کے جال میں مت آنا۔“

آپا، ملک آثمیر کی بڑی بہن اور پارو کی سگی خالہ نرادر بہن تھیں وہ آس پاس کے حالات سے واقف تھیں اس لئے اسے بھی چوکنا اور

پر سکون رہنے کی تاکید کر رہی تھیں اور وہ سنے جا رہی تھی۔



ولیمہ کی رونق ماند ہوئی تو گھر میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ سرشام ہی گاؤں کا ازلی سناٹا جھینگڑوں کی آوازوں کو نمایاں کرنے لگا تھا وہ آج اس کا انتظار کرنے کی پابند نہیں تھی اسی لئے فوراً ہی کپڑے بدل کر آرام دہ خلیے میں آگئی تھی اتنے دنوں کی تھکن اور نیند کی کمی اسے سونے پہ اکسار ہی تھی۔
 ”لیکن سوؤں کہاں؟“ اس نے صوفے کو دیکھ کر پھر بیڈ کو دیکھا وہ ابھی کمرے میں نہیں آیا تھا۔ ”اگر نیند میں صوفے سے گر گئی تو؟ ہونہر میں کیوں گروں گی؟ کل وہ بیڈ پہ سویا تھا آج میں سوؤں گی میں یہاں صوفے پہ سونے کے لئے تو نہیں آئی..... اور جب مجھے بیڈ پہ سویا دیکھے گا تو اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لے گا۔“

وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اس پر عمل کرنے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھوڑی دیر بعد وہ بیڈ پہ محو خواب ہو چکی تھی لیکن رات کا نہ جانے کون سا پھر تھا جب زوردار آہٹ پہ اس کی نیند ٹوٹ گئی اس نے چونک کر دیکھا وہ شاید غصے میں تھا اپنی گھڑی اتار کر سائینڈ ٹیبل پہ کافی زور سے بٹنی تھی اور اب بیڈ پہ بیٹھ کر جھکتے ہوئے اپنے جوتے اتار رہا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے سوتی بن گئی۔ مگر سونے میں اور سوتا بننے میں بڑا فرق ہوتا ہے پھر انتظار میں تھی کہ وہ کہاں سوتا ہے اسے یقین تھا کہ وہ بیڈ پہ نہیں سوئے گا مگر اس کا یقین رائیگاں گیا وہ کپڑے بدل کر بیڈ پہ ہی آکر لیٹا تھا۔
 ”محترمہ ماہ پیکر میں جانتا ہوں کہ تم جاگ رہی ہو اور سونے کا صرف ڈرامہ کر رہی ہو لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ مجھے تمہارے سونے یا نہ سونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مجھ پہ تمہاری موجودگی کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتی نہ بیڈ پہ سونے سے تم میرے دل کے قریب آ سکتی ہو اور نہ دور جانے سے مجھے تمہاری کمی محسوس ہو سکتی ہے اس لئے اس کمرے میں تم جیسے چاہو رہ سکتی ہو تم پہ کوئی پابندی نہیں۔ کیونکہ تمام پابندیاں اپنے دل کے لئے ہیں دل قابو تو سب کچھ قابو..... یقیناً تم سمجھ گئی ہو گی؟“ وہ اتنے سکون اور اطمینان سے بات کر رہا تھا کہ پاروتلما کے رہ گئی تھی لیکن پھر بھی ضبط کئے لیٹی رہی۔

”لیکن اس سب کے باوجود یہ بات خاص طور پہ یاد رکھنا کہ تم کبھی بھی رینا کی جگہ نہیں لے سکتیں۔“ آڑ میر کا یہ نشتر اتنا زہریلا اور تیز دھار تھا کہ پارو جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔
 ”مجھے اس کی جگہ لینے کا شوق بھی نہیں ہے ملک صاحب ہاں وہ میری جگہ لینے کی کوشش ضرور کر چکی ہے۔“ پارو سچ کہہ رہی تھی مگر ملک آڑ میر کو یہ سچ کبھی بھی گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔

”تمہاری میرے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی جبکہ میرا پورا دل ہی اس کے لئے تھا بلکہ اب بھی ہے اور جب دل ہی اس کے لئے ہے پھر تم اس دل میں کیسے رہ سکتی ہو؟“ وہ پارو کو سر تا پا جلا کر دکھا کر دینا چاہتا تھا اور پارو جل تو رہی تھی مگر دکھا نہیں ہو رہی تھی اس وقت بھی اس کا دل اس کے الفاظ پہ جیسے شعلوں کی نذر ہوا تھا مگر وہ ان شعلوں کو برداشت کر گئی۔

”میرے رہنے کے لئے دل اور بہت ملک صاحب، دلوں کی کمی کہاں؟“ وہ برداشت کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑتی انتہائی تحمل سے گویا

ہوئی اور ملک آڑ میر پہلی بار اسے دیکھ کر رہ گیا تھا زیر و بلب کی ملگجی سی روشنی میں بھی وہ دمک رہی تھی۔

”پھر مجھ سے شادی کیوں کی؟ میں تو سمجھ رہا تھا تم کبھی بھی اس شادی کے لئے ہامی نہیں بھرو گی لیکن میرا خیال ہے تمہیں اس پر پوزل کا انتظار تھا جس کے آتے ہی فوراً ہامی بھر لی گئی۔“ اس کا لہجہ طنزیہ اور کافی حد تک کاٹ دار تھا۔

”میں نے رات کو بھی کہا تھا کہ کچھ مجبوریاں دیکھنے میں شوق نظر آتی ہیں لیکن وہ شوق ہوتی نہیں اور آپ سے شادی کیوں کی؟ یہ سوال آپ اپنی ماں سے کرتے بہتر جواب ملتا کیونکہ انہوں نے ہی اپنا دوپٹہ اتار کر میری ماں کے قدموں پر رکھا تھا کہ ہم شادی کے لئے ہامی بھر لیں۔“ وہ بھی لفظ چاچا کر کہتی کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھی۔

ملک آڑ میر کو منہ توڑ جواب مل چکا تھا۔ اس لئے چپ کا چپ رہ گیا۔ مگر پھر بھی پارو کا انداز اور لب و لہجہ ذرا نہیں بھایا تھا اسی لئے سلگتی ہوئی نظر سے اس کی کمر کو گھورا تھا۔



”شنو تو ٹھہر میں اوپر چڑھتی ہوں پر دیکھ سارے سو ہے (سرخ) میر میرے، اگر ایک بھی خراب کیا تو ہاتھ توڑ دوں گی کبھی؟“ شنو کو پیری پہ چڑھنے میں ناکامی ہو رہی تھی اور درختوں اور دیواروں پر چڑھنے کی ماہر پارو کو یہ ناکامی برداشت نہ ہوئی اور فوراً آگے بڑھی لیکن ساتھ ہی اپنے لئے سرخ سرخ بیروں کی بنگل بھی ضروری سمجھی تھی۔

”چل ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی۔“ شنو بھی آخراں کی سہیلی تھی وہ بھی ”دا“ لگانا جانتی تھی۔ چند سیکنڈ بعد پارو پیری فتح کر چکی تھی پیری کی شاخوں پہ بیٹھے طوطے، بلبل اور چڑیا جو سکون سے بیٹھے بیٹھو گنگ رہے تھے پارو کی آمد پہ ایک ہلچل آمیز شور مچاتے آگے پیچھے اڑتے چلے گئے۔

”ارے کم بختو! میں کیا تمہیں کھانے لگی تھی جو یوں ترپتے ہوئے جارہے ہو؟“ اس نے اڑنے والوں کو کھری کھری سنائی۔

”ارے وہ سمجھ رہے تھے کہ پیری پہ کوئل چڑیل وارد ہو گئی ہے۔“ شنو نے اس کا مذاق اڑایا۔

”ایسی کی تیسری مجھے چڑیل سمجھنے والوں کی اور یہ تو کیوں دانت نکوس رہی ہے؟“ وہ پیری پہ چڑھ کے بھی شنو کے لئے لینے کھڑی ہو گئی تھی حالانکہ دونوں کافی گہری اور جگری سہیلیاں تھیں لیکن جہاں دونوں میں اختلاف ہو جاتا وہاں تو تو میں میں کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے روٹھ بھی جاتی تھیں۔

دیکھ پارو جھپتی جھپتی کرماسی آگئی تو اچھا نہیں ہوگا۔“ شنو نے سنجیدہ صورت بنالی اور اسی جھپتی جھپتی میں اچانک ایک دھماکہ ہوا اور پارو زمین سے آگئی۔

”ہارے پارو مر گئی..... ہائے پارو مر گئی..... ماسی پارو مر گئی۔“ شنو شور مچاتی ہوئی صحن کی سمت دوڑی اور پھر شنو کے ساتھ پارو کی اماں اور آپا بچھواڑے میں دوڑتی آئیں لیکن وہاں پارو بالکل ٹھیک ٹھاک بیٹھی کافی بلند آواز سے چیخ رہی تھی اور اپنی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

”ہائے پارو میری نہیں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ آپا پارو کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہائے اللہ پارو کی ٹانگ۔“

”ٹانگ ٹوٹے تیرے خصم کی میری کیوں توڑ رہی ہے منحوس کلمہ ہی۔“ پارو نے اندھا دھند واہلا کرتی شنو کی کمر میں دھموکا جڑ دیا اور شنو یکدم ٹھنڈی ہو گئی اور اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ پارو کی کوئی بڑی پٹی نہیں ٹوٹی سب سلامت ہیں۔

اور اس سلامتی پہ اسے تھوڑی مایوسی بھی ہوئی تھی کیونکہ وہ تو سوچ رہی تھی کہ پارو چار دن بستر پر پڑی تو دن میں تارے نظر آجائیں گے اور یہ جو ہر ایک پہ چوہدرانی بنی پھرتی ہے تھانیداروں کی طرح کام کرواتا ہے سب کچھ بھول جائے گی لیکن شنو یہ بھول رہی تھی کہ تھانیدار یا پھر چوہدری اگر ٹوٹ پھوٹ بھی جائیں تو اپنے کام پھر بھی یا آسانی نکھول لیتے ہیں۔

”اللہ سمجھے تجھے پارو میری زندگی کو عذاب بنا کر کیا ملتا ہے تجھے؟“ اماں اس کی خراشوں پہ مہم لگانے کے بعد اب اپنا ماتھا پیٹ رہی تھی۔

”اماں تیری زندگی میں نے عذاب نہیں کی۔“ پارو اماں سے زیادہ بے زار ہوئی، انداز میں وہی لا پرواہی تھی جو بچپن سے چلی آ رہی تھی اور کوئی اس لا پرواہی کو ختم نہیں کر سکا تھا۔

”پارو کیوں تنگ کرتی ہے اماں کو؟ صفیہ آپ آج کل میکے آئی ہوئی تھیں لیکن اماں کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں کیونکہ صفیہ سے چھوٹی ربیحہ کی شادی ہو رہی تھی اماں پہ کام کا کافی بوجھ تھا اوپر سے پارو نے ہر ایک کا ناک میں دم کر رکھا تھا ایک تو اوٹ پٹانگ حرکتیں اور اوپر سے منہ پھٹ زبان نے اسے زبان زد عام کر رکھا تھا ہر کوئی تو بد تو بد کرتا تھا۔

”آپا میں کب اماں کو تنگ کرتی ہوں اور انا اماں مجھے.....“

”کم بخت آگ لگے تیری اس چڑچڑ چلتی زبان کو انا دوسروں کو الزام دیتی ہے۔“ اماں نے دھتھر دے مارا اور پارو ہلہلا کر رہ گئی آنکھوں میں مونے مونے آنسو بھی جھلملانے لگے تھے۔

”دیکھا آپا؟ اب بھی میں ہی غلط ہوں ایک تو مجھے چوٹ لگی اوپر سے اماں بھی اپنا شوق پورا کر رہی ہے۔“

پارو کی بھرائی ہوئی آواز پہ صفیہ آپا کا دل بھی لمحہ بھر کو کسج گیا۔

”چھوڑو اماں کیوں پریشان ہوتی ہو اگر یہ گرمی ہے تو چوٹ بھی تو اپنے آپ کو لگی ہے ہمیں کیا، دوبارہ جا کر چڑھ جائے ہماری بلا سے۔“

آپا نے اماں کو ہلہلا ناچا ہا۔

”ارے کیسے چھوڑ دوں سولہ سال کی لوشٹا ہو گئی ہے پر عادتیں دیکھ آٹھ سالوں والی بھی نہیں ہیں ارے میں کہتی ہوں اس کے یہی ڈھنگ رہے تو میرا جینا حرام ہو جائے گا میرے سینے پہ مونگ دے گی یہ منحوس۔“ اماں اپنا سر پیٹ رہی تھی لیکن پارو پہ ذرا اثر نہیں تھا آخر صفیہ نے ہی ماں کو سمجھایا اور اللہ سے بہتری مانگتے کا مشورہ دیا۔



قمر النساء اور فخر النساء ماں باپ ک دوہی بیٹیاں تھیں اور ماں باپ کی لاڈلی بھی بہت تھیں قمر النساء بڑی اور فخر النساء چھوٹی تھیں لیکن دونوں بہنوں میں اس قدر پیار محبت اور انڈر سٹینڈنگ تھی کہ انہیں کبھی کسی اور بہن بھائی کی ضرورت یا کمی محسوس نہیں ہوئی تھی دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی

طرح سمجھتی اور چاہتی تھیں ماں باپ کے آگن میں خوب عیش و آرام کی زندگی دیکھی لیکن جیسے ہی دونوں کی شادیاں ہوئیں دونوں کی قسمت کے دھارے بدل گئے۔ قمر النساء اپنے تایا کے گھر پیار کر گئی تھیں جو ان ہی کی طرح زمیندار تھے، البتہ فخر النساء ملک خاندان کی بہو بن گئیں دونوں بہنوں کو اولاد کی امید بندھی تو بڑے ارمانوں سے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ اگر دونوں میں کسی کے ہاں بھی بیٹی بننا پیدا ہوا تو وہ دونوں کا رشتہ پکا کر دیں گی لیکن جب قمر النساء کے ہاں صفیہ اور فخر النساء کے ہاں ساجدہ پیدا ہوئی تو دونوں بہنیں اپنا سامنہ لے کر رہ گئیں دونوں کے ہاں بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں پھر قمر النساء کے ہاں دوسری بیٹی کی ولادت ہوئی اور پیدا ہونے کے پانچویں دن ہی اسے اس کی پھوپھی نے مانگ لیا اور اس طرح ربیعہ اپنی پھوپھی کی امانت ٹھہری اور ایسے حالات میں فخر النساء کچھ نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ ان کی گود بیٹے جیسی نعمت سے خالی تھی اگر یہ نعمت ان کے پاس ہوتی تو وہ کبھی بھی ربیعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتیں مگر پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مایوسی کا دامن نہ چھوڑا اور بڑی منتوں مرادوں کے بعد ان کے ہاں آثر میر پیدا ہوا آثر میر ساجدہ سے پانچ سال چھوٹا تھا قمر النساء کو بھی پانچ سال بعد بہن کی گود دوبارہ آباد ہونے پہ بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔

”قمری آپا اب تو آپ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی چاہئے میرا بیٹا جو ان ہو رہا ہے۔“ فخر النساء نے اپنے ایک ماہ کے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا تو قمر النساء ہنس پڑیں۔

آثر میر سچ سچ سب کو بہت پیارا تھا اور اسی لاڈ پیار کا نتیجہ تھا کہ وہ کافی تنگ مزاج ثابت ہو رہا تھا اور سب کو اس کا یہ مزاج بھی بہت منفرد لگتا تھا سب کا خیال کہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے یہ سب اس کا حق ہے ایسا مزاج ایک فطری عمل تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اس کی اماں فخری اس کے لئے کیا کیا سوچے بیٹھی ہے ابھی وہ آٹھ سال کا تھا جب قمری خالہ کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی یہ ان کی تیسری بیٹی تھی سبھی کو بیٹے کی آس تھی لیکن پھر بھی خادم حسین کی پیشانی پہ ناگواری کی کوئی لکیر نہ تھی بیٹی کی موہنی سی صورت دیکھی تو بے اختیار اس کا نام بھی تجویز کر ڈالا..... ماہ پیکر! نام بہت خوبصورت تھا لیکن ماحول سے میل نہیں کھاتا تھا۔

لیکن پھر بھی سب کی مخالفت کے باوجود انہوں نے اس کا نام ماہ پیکر ہی رجسٹر کروایا تھا۔ سب چاہتے تھے کہ بچی کا نام آسان سا ہو گاؤں میں نام بگاڑنے کی عادت تو عام پائی جاتی ہے سوا ماہ پیکر خادم سب کے بگاڑ کی وجہ سے پارو بن گئی اور اس کو پارو آثر میر نے ہی بنایا تھا کیونکہ جب بھی اس کی دلکش موہنی سی صورت دیکھ کر وہ قریب آتا وہ پدک کے دور ہو جاتی وہ اٹھانے کی کوشش کرتا تو ہاتھوں سے پھسل جاتی ایسے میں آثر میر کا غصہ بجا تھا کیونکہ ہمیشہ وہ خود لوگوں کی محبت اور توجہ کا مرکز ہوتا تھا اور اب اگر وہ اپنی خالہ زاد کو محبت اور توجہ دے رہا تھا تو وہ دور بھاگتی تھی اسے سال ڈیڑھ سال کی بچی سے چڑھنے لگی تھی اب وہ اسے صرف گھورنے پر اکتفا کرتا تھا اور پہلی بار اس نے اس کا نام بگاڑ کر پارو کہا تھا اماں بیٹے کی خفگی پہ ہنستی تھیں۔

وہ میٹرک میں تھا جب اماں نے بتایا کہ اس کی شادی پارو سے ہی ہوگی اسے اس اطلاع پر خاصا گہرا دھچکا لگا تھا۔

”ایسا کبھی نہیں ہوگا اماں مجھے پارو سے شادی نہیں کرنی۔“

”ارے کیوں نہیں کرنی تیرے سے زیادہ سوئی ہے۔“

”اماں سوہنی کو عمر بھر بیٹھ کر دیکھا نہیں جا سکتا ایک تو وہ مجھ سے چھوٹی ہے اور پھر اس کی حرکتیں تو پنگوڑے سے نظر آرہی ہیں پورے کا پورا

فتنہ ہے وہ۔“ آڑ میرا بھی چھوٹا تھا لیکن سمجھ بوجھ تھی اسی لئے اسے پارو کے کروتات اچھی طرح معلوم تھے۔

”منہ سنبھال کر بات کر تیری اکلوتی ماسی کی بیٹی ہے وہ۔“ اماں کو غصہ آ گیا۔

”میں بھی ماسی کا اکلوتا بھانجا ہوں ماسی کو بھی میرا خیال کرنا چاہئے اپنی ایسی پٹاخہ بیٹی میرے پلے باندھ کے میری زندگی تو خراب نہ

کرے۔“ <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

”خبردار آج ایسی بات کہی ہے، آئندہ کہی تو کبھی بخشوں گی نہیں۔“ اماں ایک دم جلال میں آ گئی اور آڑ میرے جھنجھلاتا ہوا دہاں سے اٹھ گیا۔

”ہونہ پارو سے شادی..... اسے پارو سے چڑھتی کبھی بھولے سے جو اپنی اماں کے ساتھ ان کے گھر آ جاتی تو پھر آڑ میری ہر چیز تہہ نہس کر

جاتی تھی ہر چیز کا تیا پانچا کر کے دیکھنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ آڑ میر کو اب مزید بُری لگنے لگی تھی اس کا جی چاہتا تو دس سالہ پارو اکیلے میں ملے تو وہ اس کا گلاباد بے گمروہ اکیلے ملتی بھی تو چھلا دے کی طرح غائب ہو جاتی تھی۔

خادم حسین کو پارو سے اتنی محبت اور لگاؤ تھا کہ لاڈ پیار کر کر کے اسے کافی خود سر بنا دیا تھا اس کے مزاج میں ہٹ وھری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی باپ سے ضدیں منوانے میں ماہر تھی اور قمر النساء خادم حسین کو اس کا ہم نوا دیکھ دیکھ کر ہولتی رہتی تھیں۔ پارو باپ کے زور بازو پہ عیش کر رہی تھی لیکن اس کے یہ عیش بہت تھوڑے عرصے کے ثابت ہوئے دس سال کی عمر میں باپ کا ساتھ چھوٹ گیا تھا سب سے زیادہ باپ کی کمی پارو کو ہی محسوس ہوئی اسنے دن وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی لیکن رفتہ رفتہ سب نے اسے بہلا لیا بچپنا تھا اس لئے جلد بھل گئی اس کی ضدیں عروج پہ پہنچ چکی تھیں اکثر وہ بیشتر اماں اسے ٹوکنے کی کوشش کرتیں جس پہ وہ اور زیادہ ضد کرتی حالانکہ صفیہ اور ربیعہ بھی تو ان ہی کی بیٹیاں تھیں انہیں ان کی طرف سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی مگر پارو کے معاملے میں تو ان کا دل ہمیشہ دہلتا رہتا تھا۔ وہ اس کی ماں تھیں اور یقیناً اس کے بارے میں بہتر ہی جانتی تھیں لیکن پھر بھی فخر النساء کو اپنی ہونے والی بہو پہ بڑا ناز تھا وہ اس کی حرکتوں اور شرارتوں کو معصومیت کے کھاتے میں ڈالتی تھیں۔

اور انہیں اسکی یہ شرارتیں بہت پسند تھیں کیونکہ ان کو ایسی ہی زندہ دل ہو چاہئے تھی جو ان کے گھر کو رونقوں سے بھر دیتی مگر نجانے کیوں آڑ میر حیات پارو کے لئے کہیں بھی کوئی نرم گوشہ نہیں پارہا تھا وہ اکثر اپنی خالہ سے کتر یا کتر یا رہتا تھا کبھی ان کے گھر بھی نہیں گیا تھا مگر آج کل ربیعہ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اس لئے اماں بارہا اسے ساتھ چلنے کی تاکید کر رہی تھیں مجبوراً سب کے ساتھ اسے بھی مہندی کے روز ہی آنا پڑا تھا۔

”پارو تیری ماسی واپر تے بڑا سوچنا اے۔“ تاجی نے کسی اور ہی رنگ میں کہا تھا اپنے بالوں کی چوٹی لہراتی پارو نے تاجی کی نظروں اور بات کے تعاقب میں دیکھا وہ کسی رشتہ دار سے باتوں میں مصروف تھا۔ حال ہی میں وہ شہر سے کوئی ڈگری لے کر آیا تھا اور سننے میں آیا تھا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ یا امریکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

”میری اماں کہہ رہی تھی پارو بیاہ کر اپنی ماسی کے گھر ہی جائے گی.....“ شنو نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا اور پارو جیسے اچھل پڑی۔

”اری سچ کہہ رہی ہوں میری اماں کو خود تیری اماں نے بتایا تھا۔“ شنو پرسکون تھی پارو نے ایک بار پھر آڑ میر کو دیکھا اب کے دھڑکن کی

لے بدلی ہوئی تھی۔

”کیوں؟“ ”ہوگئی نالٹو؟“ شنوا اور تاجی نے ایک ساتھ اسے چھیڑا۔

”ارے لٹو ہوتی ہے میری جوتی ہونہ میں کسی کو کیا جانوں؟“ وہ بدتمیزی سے کہتی ہوئی صحن کے دوسرے حصے کی سمت مڑ گئی اور ملک آڑ میر حیات نے خوشخوار نظروں سے اسے دیکھا اس کی کمر پہ موٹی سی چوٹی جھول رہی تھی چوٹی کے ہر بل میں تقاخر جھلک رہا تھا اور اس کا جی چاہا اس کا یہ فخر و غرور یہ اکڑ چکنا چور کر کے رکھ دے۔

مہندی اور پھر شادی کے فنکشن میں بھی وہ بس اندر ہی اندر کھولتا رہا تھا پارو کی شکل جہاں بھی نظر آتی نفرت سے رخ موڑ لیتا تھا اور پارو جو اپنی سہیلیوں سے بچنے کے لئے اتنی کوفت بے زراری اور نفرت کا مظاہرہ کر کے آگئی تھی اپنے دل کی دھڑکنوں پہ قابو ہی نہ پا رہی تھی وہ مہندی اور شادی کی تمام رسموں میں چوری چوری اسے دیکھتی رہی لیکن وہ کچھ زیادہ ہی روکھا پھیکا محسوس ہو رہا تھا۔ پارو جیسی نٹ کھٹ لڑکی کو چاہت کے مدھوش جذبے نے چھو اتو وہ چند دنوں میں ہی نکھرتی چلی گئی تھی..... اس کی شرارتوں میں اب شوخیاں بھی سا گئی تھیں ان ہی دنوں معلوم ہوا کہ آڑ میر انگلینڈ جا رہا ہے اسے یونیورسٹی کی طرف سے سکالرشپ مل گیا تھا۔

پارو تھوڑی اداس ہوئی لیکن جب خالہ نے آکر باقاعدہ منگنی کی رسم کرنے کا اظہار کیا تو پارو کی یہ اداسی کچھ دیر کے لئے رفع ہو گئی تھی قمر النساء کو اپنی چھوٹی بہن پہ حیرت ہوئی جوان کی اتنی بددماغ بیٹی کو خوشی خوشی بہو بنانا چاہ رہی تھی۔

”قمری آپا کیوں جھلی ہو گئی ہے پارو تو میری خواہشوں کا آئینہ ہے مجھے ایسی ہی بیٹی کی ضرورت ہے اب ساجدہ کو دیکھو چپ چاپ بڑی ہوئی چار جماعتیں پڑھیں اور اپنے گھریار کی ہو گئی نہ گھر میں موجودگی کا پتہ چلا نہ گھر سے غیر موجودگی کی خبر ہوئی پردیکھنا جب پارو تیرے گھر سے رخصت ہوگی تو تجھے بڑا احساس ہوگا کہ پارو چلی گئی ہے۔“ انہوں نے بہن کو تسلی دلا سہ دیا اور پھر منگنی کی تیاری شروع کی گئی آڑ میر کے جانے سے دو روز قبل پارو کو منگنی کی انگوشی پہنائی گئی اس کی سکھی سہیلیوں نے اسے خوب خوب تنگ کیا اور وہ کھلکھلاتی ہوئی ہر طرف رنگ بکھیرتی رہی اس کے دل میں نئے جذبوں نے جنم لیا تو ہر سو خوشبو کا بیرا ہو گیا تھا اس کے کورے کاغذ سے دل پہ صرف اور صرف آڑ میر کا نام لکھا تھا اور وہ اس میں خوش تھی۔



منگنی کی وجہ سے آڑ میر کی گھر والوں سے خاصی بد مزگی ہو چکی تھی۔

اور اسی بد مزگی میں ہی وہ گھر سے رخصت ہوا تھا پارو کے خلاف اس کے دل میں شعلے لپکتے تھے لیکن اماں نے اس کے انکار کے باوجود زبردستی اس کی منگنی کر کے ہی دم لیا تھا لیکن اس کی وجہ سے وہ اپنی ماں سے بدظن ہو چکا تھا اسے احساس ہونے لگا کہ اماں کو صرف اور صرف بہن اور بھانجی کی پروا ہے میری زندگی اور میری خوشیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

رینا اس کی کلاس فیلو تھی بنیادی طور پر وہ پاکستانی ہی تھی البتہ اپنے طور اطوار سے وہ کہیں سے بھی پاکستانی نہیں لگتی تھی لیکن اس کے باوجود آڑ میر کو اس کی ایک بات اچھی لگی کہ وہ زیادہ فریج نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی شارٹ ڈریس پہنتی تھی ہمیشہ جینز شرٹ میں رہتی تھی اسے لڑکوں کی بے تکلفی اور دوستی کے نام پہ ”بے حیائی“ بھی ناپسند تھی اسی لئے اسے سنجیدہ سنجیدہ آڑ میر حیات سب سے مختلف نظر آیا اور ایک پاکیزہ دوستی کا آغاز

کیا جب دونوں کو اپنے جذبوں کی شدت کا احساس ہوا تو دونوں نے بہت اعتماد اور سکون سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

آؤ میر پہلے ہی گاؤں کی گنوار اور جاہل پارو سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا سو بہت آسانی سے رینا کو اپنی زندگی کا شریک سفر بنالیا تھا ایک سال دو تہی میں اور دوسرا سال میاں بیوی کے رشتے میں بندھ کے گزارا تو دونوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا مشکل ہو گیا تھا دوسال بعد جب وہ واپس پاکستان لوٹا تو رینا اس کے ساتھ تھی لیکن رینا کا وجود اماں پہ کسی ہم کی طرح پھٹا تھا انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹے سے ملنے کی بجائے سر قدام کر قدم واپس موڑ لئے تھے۔

”اماں میری بات تو سنو.....“ آؤ میر یکدم آگے بڑھا مگر اماں اس کے بڑھنے سے پہلے ہی چکرا کر گری تھیں ملک ضمیر حیات (آؤ میر کے والد) بھی اس دفعہ چپ نہیں رہ سکے تھے۔

”چلے جاؤ یہاں سے مر گئے تم ہمارے لئے۔“ انہوں نے ہمیشہ آؤ میر کو ماں سے اچھے دیکھا تھا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ بس کچھ دیر کے لئے ماں کو ستار ہا ہے لیکن وہ ماں کو ستانے کے لئے اس حد تک چلا جائے گا انہیں امید نہیں تھی اور جب وہ حد پار کر گیا تو ان کا مشتعل ہونا لازمی امر تھا.....

رینا حیرت سے اس سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شام کا وقت تھا اس لئے آؤ میر اسے لے کر کہاں جا سکتا تھا واپسی کے لئے گھر سے نکلا تو پچا قدم سے سامنا ہوا۔

ان کا گھر ملک ضمیر حیات کے پڑوس میں ہی تھا بائیں دیوار دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار تھی پچا قدم اسے اور رینا کو ساتھ ہی لے آئے تھے پچا قدم کی بڑی بیٹی مایین شروع سے ہی آؤ میر کو بہت پسند کرتی تھی لیکن اپنی تائی کی زبان پہ ہمیشہ پارو کا ورد دیکھ کر مایین کا خون جل کر رہ جاتا تھا لیکن آج جب پارو کی جگہ کسی اور کو دیکھا تو مایین کو قدرے تسلی ہوئی تھی ایک دم دل پہ پھواری برسی..... انہوں نے رینا کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ پچا قدم کی فیملی کو اپنا ہم نوا دیکھ کر آؤ میر کو تھوڑا حوصلہ ہو گیا تھا اس کے خیال میں وہ اماں ابا کو سمجھانے اور راضی کرنے میں اس کی مدد کر سکتے تھے وہ اپنی سوچوں میں غلطیاں تھا اور رینا اپنی سوچوں میں.....

”آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ آپ کی آنکھ منٹ ہو چکی ہے.....“ تنہائی ملتے ہی وہ بولی۔

”میں اس آنکھ منٹ کو نہیں مانتا کیونکہ اس رشتے میں میری مرضی یا پھر میری پسند ایک پرسنٹ بھی شامل نہیں تھی اور نہ ہی اب ہے میں نے اگر کسی کو پسند کیا ہے تو وہ صرف تم ہو اسی لئے شادی بھی کر چکا ہوں اگر اماں ابا نہیں مانے تو میں شہر جا کر فلیٹ لے لوں گا مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔“ آؤ میر حیات بھی ان ہی کی اولاد تھا اپنی مرضی چلانے والا۔

”لیکن آپ کو کم از کم اس رشتے کا ذکر کرنا چاہئے تھا میں کیوں خواہو کہ کسی کی قسمت کے آؤے آگئی۔“

رینا کو افسوس ہوا تھا مگر آؤ میر نے اسے زیادہ دیر اس کیفیت میں نہیں رہنے دیا تھا بہت جلد وہ آؤ میر کو اپنی قسمت ماننے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن اماں ابا نے اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مجبوراً آؤ میر رینا کو لے کر شہر چلا گیا تھا جہاں وہ اپنی تنہا اور الگ دنیا بسانے میں مصروف ہو چکا تھا اور اس دنیا سے کچھ دور پارو کی دنیا ساکت رہ گئی۔

”آؤ میر شادی کر کے بیوی کے ساتھ واپس آیا ہے۔“ یہ اطلاع اس کے ہنستے کھیلنے والے دل پہ تیزاب کی مانند گرئی تھی اس کے خواب اس کے خیال اس کی خواہشیں اس کے ارمان سب جل گئے پہلی پہلی محبت اور محبت کے خواب اتنی جلدی بے وقعت ہوں گے اسے اندازہ نہیں تھا اماں بھی اس خبر سے ڈھسے گی تھیں کیونکہ آج کل وہ صنفیہ آپا کی طرف سے بھی پریشان تھیں صنفیہ شادی کے اتنے برس بعد بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھیں اور ان کے سرسرا والے آج کل بچوں کے لئے کچھ زیادہ ہی بے قراری ظاہر کر رہے تھے پہلے تو ان کا شوہران کے ساتھ تھا مگر اب وہ بھی بچوں کی خواہش ظاہر کرنے لگا تھا۔

جس پہ صنفیہ آپا پریشان ہونے لگی تھیں اور ان کی پریشانی اماں کا بھی دامن پکڑ چکی تھی ایک تو جوانی میں ہی بیوی کا روگ لگ گیا اور پرے تین تین بیٹیوں کا بوجھ..... دو بیٹیوں کے فرض سے تو وہ فارغ ہو چکی تھیں تیسری کا مسئلہ ابھی باقی تھا اور تیسری کے لئے ان کے دل میں تھوڑا اطمینان بھی رہتا تھا مگر آج وہ اطمینان بھی رخصت ہو چکا تھا۔

”اب کیا ہوگا؟ پارو کا کیا بنے گا؟“ اماں کی آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے خدشے ناچنے لگے پارو خود بھی اس دھچکے کا شکار ہوئی تھی لیکن نبھانے کیوں وہ اپنا روگ اماں کو نہیں لگانا چاہتی تھی۔

”دیکھ اماں مجھے تو وہ شروع سے ہی چنگا نہیں لگتا تھا اپنے آپ کو بڑا طرم خان سمجھتا ہے میں بھی کسی سے کم نہیں میری طرف سے بھاڑ میں جائے میرے لئے کوئی کمی ہے رشتوں کی، ایک اشارہ کروں تو لائن لگ جائے۔“ اس نے اماں کو تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ اپنے اندیشوں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں ایسی ہی کچھ کیفیت پارو کی بھی تھی، مگر وہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی کہ آؤ میر حیات اس کے لئے کیا اہمیت رکھتا تھا اگر ظاہر کرتی تو الٹا سہیلیاں اس کا مذاق اڑاتیں اور وہ اپنی محبت کا اپنے جذبول کا مذاق نہیں بنوانا چاہتی تھی۔

اسی لئے اپنے اس زخم کو وہ بے نیازی اور لاپرواہی کے مہم سے ڈھک رہی تھی حالانکہ اس پہ جو قیامت گزر چکی تھی اس کے بعد ایسا حوصلہ اور ہمت رکھنا کافی حیران کن عمل تھا پارو کی سہیلیوں کو پتہ چلا تو انہیں بھی افسوس ہوا تھا مگر پارو نے خود پہ کوئی افسردگی طاری نہیں ہونے دی تھی انتہائی جذباتی، منہ پھٹت اور بدتمیز پارو سے ایسے رویے کی امید رکھنا اپنی امیدوں پہ پانی پھیرنے کے برابر تھا لیکن یہاں تو سب کچھ الٹ ہی نظر آ رہا تھا پارو سہیلیوں کی باتوں اور اماں کی پریشانی کی وجہ سے لاپرواہی کا چولا پہن چکی تھی اسے آؤ میر سے کوئی مطلب نہیں تھا لیکن درحقیقت دل رو رہا تھا۔



صنفیہ کی طلاق قمر النساء کو بستر سے لگا گئی اور قمر النساء کا دکھ فرائی النساء کو کھائے جا رہا تھا وہ بہن کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھیں پہلے پارو کی طرف سے دکھ ملا ب صنفیہ کی طرف سے تو عمر بھر کا داغ لگ گیا تھا قمر النساء کی ساری توانائی رخصت ہو گئی وہ دنوں میں حریہ بوڑھی ہو گئی تھیں..... انہی دنوں ساجدہ آپا اور آؤ میر کا کھراؤ ہو گیا تھا اور آؤ میر سے یہ پتہ چلا کہ رینا امید سے ہے یہ خبر اماں کو ملی تو پہلو بدل کر رہ گئیں اور ان کی بے چینی ملک ضمیر حیات سے چھپی نہ رہ سکی۔

”نیک بخت اتنی پریشان کیوں ہو؟“ انہوں نے اپنی پگ اتار کر چار پائی پہ رکھی اور اپنے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے گھر والی سے

مخاطب ہوئے۔

”ابھی بھی پوچھتے ہو ملک جی کہ پریشان کیوں ہو؟“ ان کا لہجہ بھرا گیا تو ملک جی لہجہ بھر کے لئے چپ سے ہو گئے۔

”دیکھ فخری بیگم تیری بہن بھی صرف ایک ہے اور ہمارا پتر بھی صرف ایک تیری بہن سمجھدار ہے اولاد کی منہ زوریاں سمجھتی ہے لیکن ہمارا پتر نا سمجھ ہے ماں باپ کی مجبوریوں میں سمجھ سکتا اس لئے ایک کو سمجھا اور ایک کو خود سمجھ.....“ ملک ضمیر حیات کی بات پر وہ خود نا سمجھی سے دیکھنے لگی تھیں۔

”ارے میری جھلی مکانی عقل سے کام لے اپنے پتر کی خوشی میں خوش ہونا سیکھ اپنے پوتے پوتی کے لئے دعا کر ہو سکتا ہے رب پارو کے نصیب اور اچھے کردے اور بہن کو سمجھا کہ اولاد کسی کے بھی اختیار میں نہیں ہوتی اولاد داڑیل گھوڑی کی طرح ہوتی ہے کبھی قابو آ جاتی ہے کبھی بے قابو ہو جاتی ہے اور ہماری اولاد بھی بے قابو ہو گئی ہے لیکن بے قابو اولاد ہو یا گھوڑی اسے چھوڑ تو نہیں جا سکتا؟“ انہوں نے رفتہ رفتہ بیوی کو کچھ قائل کر رہی لیا تھا اور پھر اماں ابا کے ساتھ رینا کی ڈلیوری سے ایک روز قبل ان سے ملنے شہر آ گئی تھی۔

”آئی آپ؟“ فلیٹ کا دروازہ رینا نے ہی کھولا تھا۔ آٹھ گھر پہنچیں تھے اس نے کافی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ اماں بھی اس کے خلاف دل میں موجود تمام کدورتیں دھو کر آئی تھیں کافی دیر بعد آٹھ گھر میں داخل ہوا تو ٹھک گیا۔

”اتنی دیر لگا دی آپ نے، انکل اور آئی کب سے آئے بیٹھے ہیں۔“ رینا اٹھ کر اس کے قریب گئی وہ رینا اور اماں ابا کے اچھے تعلقات کی جھلک ان کے چہروں سے دیکھ چکا تھا اسی لئے آگے بڑھ کر اس نے بھی ماں کے قدم تھام لئے۔

”اماں مجھ سے جو بھی غلطی ہوئی ہے مجھے معاف کر دینا میں رینا کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس نے پردیس میں میرا اتنا ساتھ دیا میرا خیال رکھا اپنے دیس آ کر میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پارو سے منگنی آپ کی اپنی جلد بازی تھی میں نے آپ کو روکا تھا کہ ایسا مت کریں۔ وہ بھی ماں کو دکھ دے کر خوش نہیں تھا اسے بھی ندامت ہوتی تھی مگر اب ساری ندامت دھل چکی تھی۔



”آٹھ میرا آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہے۔“ رینا ہسپتال جانے سے پہلے اس کے قریب آ گئی تھی۔

”جب سے تم ملی ہو تب سے وعدے ہی تو کر رہا ہوں۔“ وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔

”جو میں کہہ رہی ہوں وہ بتائیں۔“ رینا بضد تھی۔

”اوکے بابا کہو کیسا وعدہ لینا ہے۔“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ آئندہ کبھی انکل اور آئی کا دل نہیں دکھائیں گے اور کبھی ان کی کسی بات سے اختلاف نہیں کریں گے آپ ان کے اکلوتے بیٹے ہیں ان کے بہت سے ارمان آپ کی ذات سے جڑے ہیں اگر آپ ان کے ارمانوں کو جھٹکتے ہیں تو ان کا دل سمجھ جاتا ہے پلیز مجھ سے وعدہ کریں جو وہ کہیں گے آپ وہی کریں گے۔“

رینا نے اس سے وعدہ لیا تھا وہ آج تو وہ اپنے آنے والے بچے کے لئے اتنا خوش تھا کہ رینا اس سے دنیا چھوڑنے کا وعدہ لیتی تو وہ فوراً یہ

وعدہ بھی کر لیتا اسے اپنے بچے کی آمد کا بڑی بے چینی اور شدت سے انتظار تھا اماں ابا بھی ساتھ ہی ہسپتال گئے دن بھر کی ٹریٹ منٹ کے بعد رینا کو شام کے وقت لیبر روم لے جایا گیا تھا اور پھر آڑ میر کے انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئیں۔ اماں جائے نماز بچھا کر مسلسل دعائیں کر رہی تھیں ابا بھی پریشان تھے تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ کیس میں کافی پیچیدگیاں ہیں دونوں میں سے کسی ایک کی جان بچائی جاسکتی تھی آڑ میر کے لئے دونوں ہی اہم تھے وہ دونوں کی زندگی چاہتا تھا لیکن دل پہ پھر رکھ کے صرف ایک کا نام لینا بہت دشوار مرحلہ تھا پھر بھی اس نے رینا کا نام لیا تھا مگر رب کو کچھ اور منظور تھا مردہ بچے کو جنم دینے والی رینا خود بھی ڈلیوری کے بعد صرف ایک گھنٹہ جی سکی تھی اور آڑ میر خالی ہاتھ کھڑا دھواں دھواں نظروں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے سامنے پڑے مردہ وجود اس کی زندگی کا حصہ تھے اور اس کی زندگی سے کٹ گئے ہیں زندگی کے حصے کٹ جائیں تو انسان یونہی بے حس و حرکت ہو جاتا ہے وہ بھی بے حس ہو چکا تھا اماں ابا اس دکھ پہ بہت روئے تھے لیکن وہ تو رونے کے قابل بھی نہیں تھا۔ آڑ میر کا سنبھلنا بے حد مشکل ہو چکا تھا اس کے دل میں خلا بن چکا تھا۔



رینا کی موت کا سن کر صنفیہ اور ربیعہ دونوں بہنیں اظہار تعزیت کے لئے آئی تھیں اماں ان دونوں سے شرمندہ بھی تھیں اور بیٹے کے دکھ پہ دکھی بھی ہو رہی تھیں۔

”خالہ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں اگر پارو کا نصیب آپ کے آنگن سے وابستہ نہیں تھا تو اس میں آپ کا یا پھر کسی اور کا کیا قصور آپ سمجھدار اور با حوصلہ ہیں آپ اپنے آپ کو سنبھالیں اور آڑ میر کو بھی تسلی دیں اس وقت اسے آپ کی تسلی اور محبت کی ضرورت ہے۔“ ربیعہ نے کافی متانت اور بردباری سے اپنی خالہ کو سمجھایا تھا۔

”پر میں قمری آپا کو کیا منہ دکھاؤں گی اور جس کے لئے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا وہ بھی نہیں رہی اور ساتھ ہی اولاد جیسا دکھ بھی دے گئی کیسی قسمت تھی بد نصیب کی.....“ انہیں سچ سچ رینا اور بچے کی موت کا بہت دکھ پہنچا تھا۔

”یہ بھی اللہ کے فیصلے ہیں خالہ حوصلہ رکھو رب بہتر کرے گا اور اماں کی فکر نہ کرو وہ بھی سنبھل جائے گی اس پہاڑی زندگی میں اتنے اتنے دکھ دیکھے ہیں ایک اور سہمی۔ صنفیہ کی مسلسل خاموشی کے باعث ربیعہ کو ہنسی بولنا پڑ رہا تھا۔ ربیعہ پھوپھی زاد سے بیانی گئی تھیں اور اس وقت دو سالہ بیٹے کی ماں تھیں اس کی طرف سے قمر النساء کا دل پر سکون تھا کافی دیر وہ لوگ بیٹھی رہیں آڑ میر سے بھی سرسری سا سامنا ہوا وہ کچھ نہیں بولا تھا۔



رینا کی موت کے ایک سال بعد اماں ابا نے باہمی مشورے کے بعد ایک ارادہ کیا تھا اور ان کا ارادہ جب آڑ میر کی سماعتوں تک پہنچا تو وہ پورے ایک سال بعد کسی آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑا تھا۔

”پھر وہی پارو؟ اماں یہ پارو میری زندگی کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہی؟ یہ پارو مر کیوں نہیں جاتی؟ رینا کی جگہ یہ کیوں نہیں مری آسپ کی طرح چمٹ گئی ہے۔ میری ذات کو، اس کی وجہ سے آپ نے رینا کو ٹھکرایا گھر سے نکال دیا اسے، اسی کی وجہ سے آپ نے میری خوشیاں قبول نہیں

کیں اسی کی وجہ سے آپ کو اپنے سگے بیٹے کی پروا نہیں رہی کاش میں اس پارو کا قتل کر سکوں۔“

آٹھ میر کا بس چلتا تو پارو کو کسی بم سے اڑا دیتا وہ پارو کا نام سنتے ہی ہتھ سے اکھڑ گیا تھا اسے پارو کی ذات سے نفرت اور زیادہ ہو گئی تھی اس کا نام ہی اسے شعلوں پہ گرانے کے لئے کافی تھا۔ اماں ابا اس کا اس قدر شدید رد عمل دیکھ کر اس بار خوش نہیں ہوئے تھے انہوں نے اسے کہہ دیا تھا اس بار حتمی فیصلہ کر لے، والدین عزیز ہیں تو ان کی بات ماننی ہوگی ورنہ..... اور وہ اس بار تمام ہتھیار ڈالنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

”پارو ایک بار اس گھر میں آ جاؤ بڑے حساب نکلے ہیں تمہاری طرف، تم نے میری زندگی اجیرن کی ہے میرے والدین کو بھی میرا نہیں رکھا میں تمہارا پھر بھی نہیں ہوں گا۔“

اس نے پارو کے خلاف اپنے دل میں ایک نفرت کا جہان آباد کرتے ہوئے اپنی رضا مندی اماں ابا کے حوالے کر دی اور اماں کے تو سمجھو قدم ہی زمین پہ نہ پڑ رہے تھے انہوں نے آٹھ میر کو ہزاروں دعاؤں دے ڈالیں اس کے ماتھے پہ پیار بھی کیا اور وہ خاموش سرد مہری سے بس اماں کا چہرہ دیکھتا رہا اس کی خوشی میں وہ لوگ خوش نہیں ہوئے تھے اب ان لوگوں کی خوشی میں وہ خوش نہیں تھا اس کے تمام احساسات پاٹ ہو چکے تھے اس کے دل میں اب سردا ہو کر دکھتا تھا۔ البتہ نفرت کے احساس سے ٹھٹھیں مارتا ہوا۔



”میری طرف سے انکار ہے.....“ پارو نے اماں اور ماسی کے سامنے دو ٹوک اور صاف صاف انکار کر دیا تھا۔

”پارو زبان بند رکھ اپنی۔“ اماں کو غصہ آیا اس کی منہ پھٹ زبان سے پہلے ہی وہ ڈرتی تھیں آج وہ ماسی کے سامنے کو بھی لگی لپٹی رکھے بغیر بول پڑی تھی مزید تجانے کیا گل افشانی کرتی۔

”اماں میری زبان بند ہے، مھلوانے کی کوشش نہ کر، مجھے تیری بہن کے گھریباہ نہیں کرنا تو نہیں کرنا بس میں نے کہہ دیا۔“ پارو کو پاس ہی بیٹھی خالدہ فخر النساء کی کوئی پروا نہیں تھی۔

خالدہ چپ ہو گئیں انہیں پتہ تھا ایک بار رشتہ توڑ کر دوبارہ جوڑنے کا یہی انجام ہوتا ہے مگر وہ کسی بھی حال میں اپنی بہن سے رشتہ جوڑنا چاہتی تھیں انہوں نے بڑی بہن سے ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگی پھر ملک ضمیر حیات بھی بیٹے کی وجہ سے شرمندہ ہو رہے تھے ایسے میں فخر النساء سے نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا تھا اور اماں کو نرم پڑتے دیکھ کر پارو وضد کر بیٹھی اس نے انکار کر دیا تھا.....

”قمری آپا ہم پرسوں پھر آئیں گے آپ آرام سے صلاح مشورہ کر لیں۔“ وہ جاتے جاتے ان کو کچھ اور وقت دے گئیں تاکہ وہ پارو کو سمجھا سکیں لیکن پارو تو کسی کو پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دے رہی تھی۔

”آخر تو چاہتی کیا ہے؟“ اماں کو پارو پہ تاؤ آ رہا تھا۔

”بس میں اس سے بیاہ نہیں کرنا چاہتی اماں میرا بیاہ جس سے چاہے کر دے پر اپنی بہن کے بیٹے کا نام نہ لے میرا دل جل جاتا ہے اس کے نام سے۔“

پارونخت اور نفرت سے کہتی باہر چلی گئی اور اماں کے لئے اور زیادہ پریشانی چھوڑ گئی تھی پھر صفیہ آپا نے انہیں تسلی دی اور اسے پیار سے سمجھانے کا مشورہ دیا تھا مگر پارو کو ملک آڑ میر حیات سے اس قدر نفرت اور بے زاری ہو چکی تھی کہ وہ نہ پیار سے سمجھ رہی تھی نہ ڈانٹ سے..... ایسے میں اماں کے سر میں نجانے کیسا درد اٹھا کہ شہر کے ہسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا صفیہ اور ربیعہ تو پریشان تھیں ہی پارو کا بھی بُرا حال ہو چکا تھا ان بہنوں کا واحد سہارا صرف اماں ہی تو تھیں اور ان ہی کے دم سے آج وہ ایک چھت تلے بیٹھی تھیں۔

قمر النساء نے ہوش میں آنے کے بعد بھی پارو سے مان جانے کی التجا کی تھی اور پارو نے چم چم نہر بہاتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا اور نہ ابھی تک اپنے ٹھکرائے جانے کا زخم پارو کے دل کو بُری طرح تڑپا رہا تھا اس کا جی چاہتا جس طرح ملک آڑ میر نے اس کی محبت اس کے معصوم جذبات اور اس کی ذات کو ٹھکرایا تھا اسی طرح وہ بھی اسے ٹھکرا سکتی بلکہ ایک بار نہیں کئی بار ٹھکراتی تب بھی اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوتا مگر اماں کی تکلیف کے آگے ہار گئی اس نے اماں کی خاطر ملک آڑ میر کی یہ گستاخی درگزر کر ڈالی لیکن اس کے اندر جو ابال اٹھتے تھے وہ اماں کو بخوبی نظر آتے تھے انہیں معلوم تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے اسی لئے رخصتی سے قبل انہوں نے اپنے ہاتھ جوڑ کے اسے اپنی عزت اور تربیت کی لاج رکھنے کا واسطہ دیا تھا اور وہ جو کبھی بھی کسی بھی چیز کے آگے جھکتی نہیں تھی نہ ہی موم ہوتی تھی۔ اور نہ ہی کبھی اس پہ کسی چیز کا اثر ہو سکتا تھا وہی ماں کے جڑے ہوئے اور بے بسی سے بہتے آنسو دیکھ کر جھک گئی تھی موم ہو گئی اس پہ ماں کے دکھوں کا اثر ہو گیا تھا اسے ماں کی تکلیف اور پریشانی کا احساس ہو گیا تھا اس نے اپنے دل سے عہد کر لیا کہ اب کبھی اماں کو تنگ نہیں کرے گی چاہے کچھ بھی ہو اور اس عہد کو نبھانے کے لئے ابھی اسے کچھ وقت کی ضرورت تھی ابھی اسے صبر و ضبط کے آداب سیکھنے کے مراحل سے گزرنا تھا۔ اس کے اندر پہلے جیسے جوش اور غصے کے ابال اٹھتے تھے مگر وہ برداشت کر رہی تھی یعنی برداشت کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا کیونکہ کل رات سے لے کر اب تک وہ آڑ میر کے کچھ ڈھکے چھپے اور کچھ عیاں ہوتے نشتر کا فی حد تک خاموشی سے سہہ چکی تھی اور آئندہ بھی وہ اپنے عہد پہ عمل پیرا ہونا چاہتی تھی اس نے سب کو ستانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا..... اب شاید وہ صرف اور صرف اپنے آپ کو ستانا چاہتی تھی اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی۔



آج وہ شادی کے دو دن بعد پہلی بار میکے جا رہی تھی اس کے ساتھ فروٹ، مٹھائیاں اور میوہ جات کے ٹوکے بھیجے جا رہے تھے۔ آڑ میر صبح سویرے ہی شہر جانے کے لئے نکل چکا تھا اس نے شہر میں ایک دوست کے ساتھ مل کر پارنٹر شپ کے طور پہ بزنس شروع کر رکھا تھا نیا نیا کام جمایا تھا اس لئے زیادہ توجہ کا حامل تھا فخر النساء نے روکنے کا ارادہ کیا پھر رک گئیں کہ جاتا ہے تو جائے شام تک آجائے گا اور انہوں نے شام تک آنے کی تاکید بھی کی تھی لیکن پارو کو پتہ تھا کہ وہ نہیں آئے گا شام کو جب ربیعہ اپنے شوہر کے ساتھ اسے لینے کے لئے آئی وہ اس وقت بھی نہیں آیا تھا اور پارو چلی بھی گئی تب بھی اس کی آمد کا کوئی آثار نہیں تھا اور پارو آج ایک نئے عمل سے گزر رہی تھی یعنی دکھاوے اور چھپانے کے عمل سے اس نے آج تک کچھ نہیں چھپایا تھا سوائے آڑ میر کی محبت کے جو وہ اس سے کرتی تھی اور آج بھی وہ سب کچھ بتا رہی تھی سوائے آڑ میر کی نفرت کے جو وہ اس سے کرتا تھا اس نے سہیلیوں کے سامنے دکھاوا کیا اماں اور بہنوں سے سب کچھ چھپایا تاکہ وہ لوگ اس کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ البتہ

خود اس نے تنہائی ملتے ہی خوب دل کھول کر آنسو بہائے تھے اور اپنے دل کا غبار نکالا تھا۔



پارو کو واپس سرال آئے ہوئے ہفتہ ہو چکا تھا لیکن آڑ میرا بھی تک نہیں لوٹا تھا ملک ضمیر حیات دو بار اسے فون کر چکے تھے لیکن وہ جوابا یہی کہتا کہ کام نیا نیا ہے توجہ مانگتا ہے اور وہ ہمیشہ اس جواب پہ جھنجھلا جاتے کہ بیوی بھی نئی نئی ہے توجہ مانگتی ہے کچھ اس کا ہی خیال کر لو جس پہ وہ جلد آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیتا تھا لیکن اماں کو بیٹے کی فطرت کا اندازہ تھا انہیں احساس تھا کہ وہ انہیں..... کبھی مار (اندرونی مار، سزا) دینا چاہتا ہے اور یہ سارے بہانے صرف پارو کے لئے بنا رہا ہے حالانکہ پارو کو اس کے ہونے اور نہ ہونے کی کوئی پروا نہیں تھی وہ ان آٹھ دن دنوں میں اپنے لئے مصروفیت ڈھونڈ چکی تھی۔

میکے میں تو اس کا مشغلہ تھا دیواروں اور درختوں پہ چڑھنا بچوں کے ساتھ کھیلنا اور سہیلیوں کے ساتھ شرارتیں کرنا دن بھر اماں کو چھیڑنا اور پھر صلواتیں سننا البتہ یہ سارے کام وہ یہاں نہیں کر سکتی تھی اس لئے خالہ اماں کے کئی کام اپنے ذمے لے لئے تھے۔ جن میں مصروف ہو کر وہ کافی مطمئن اور پرسکون بھی تھی اس وقت بھی وہ پورا صحن جھاڑو سے صاف کر کے مرغیوں کا ڈربا کھولے ان کو دانہ ڈال رہی تھی جب برابر والے گھر کی دیوار سے ماہین کا چہرہ نمودار ہوا لیکن پارو مرغیوں کی چہل قدمی اور دانہ چگنے کا منظر دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ دیکھ نہ سکی۔

”گلتا ہے آڑ میرا کچھ زیادہ ہی گہری سوچیں سوچ گیا ہے؟“ ماہین کا لہجہ کافی خوشگوار تھا لیکن اس خوشگوار بیت کے پیچھے کانٹوں کی چھین پل بھر میں اسے اپنا آپ باور کروا گئی تھی۔

”جتنی سوچیں مجھے سوچ کر گیا ہے اتنی ہی میں نے بھی اس کے ساتھ بھیجی ہیں میں تو رات کو سو جاتی ہوں وہ تو سوتا بھی نہیں۔“ پارو نے مٹھی سے سارا باجر مرغیوں کے آگے گراتے ہوئے ہاتھ جھاڑو اور پوری کی پوری ماہین کی سمت گھوم گئی۔

”اگر رات کو سوتا ہی نہیں تو پھر تمہارے پاس ہی آ جائے نا؟“ ماہین کے لہجے میں طنز و افر تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرائی اور ماہین کا دل ملگ گیا۔

”وہ تو آتا ہے میں نے ہی منع کیا تھا اصل میں باجی جدائی میں بڑا مزہ ہے پیار بڑھتا ہے۔“ پارو بھی اس کی رگ جان چکی تھی ماہین کا رنگ پیلا پیلا ہونے لگا تھا۔

”یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہ شہر میں رینا کی یادیں تازہ کرنے کے لئے رہتا ہے۔“

”یادیں بھی تو ان ہی کی تازہ کی جاتی ہیں جو مردہ ہو جاتے ہیں اور مردہ چیزوں سے مجھے کیا مطلب اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے میں تو زندہ ہوں.....“ پارو آخر پارو تھی۔ ماہین کو دیوار سے اترتے ہی بنی لیکن بعد میں اس کا دل کچج کچج کر رہ گیا تھا وہ آڑ میرا کاروبار تو برداشت کر سکتی تھی مگر لوگ..... جو طنزیہ نظروں سے دیکھتے اور ٹوک دارتیں کرتے تھے وہ برداشت کرنا ذرا مشکل ہو جاتا تھا۔

”پارو کیوں کھڑی ہے پتر؟“ اماں رسوئی (کچن) سے نکلیں تو اتنی دیر سے اسے یونی چپ چاپ کھڑے دیکھ کر تشویش سے پوچھ بیٹھیں۔

”کچھ نہیں بس وہ ماہین باجی کھڑی تھیں اس لئے میں بھی رک گئی۔“ اس نے سر جھٹک کر اپنی سوچوں کو بھی جھٹک دیا تھا۔

”اماں ایک بات کہوں؟“ پارونے بھی کبھی بات کرنے سے پہلے کسی سے اجازت لینا تھی حیرت کا مقام تھا۔

”ارے پتر لکھ واری آکھ۔“ خالص پنجابی اور خالص محبت سے اجازت دی گئی۔

”تو بات سے پیار کرتی ہے یا باتا تجھ سے پیار کرتا ہے؟“ اس کی بات پہ اماں کے چہرے پہ چمک اور رنگ دوڑ گئے اور کچھ بھولی بسری شرم و حیا

بھری مسکان بھی ہونٹوں پہ آٹھری۔

”پگلی یہ کیا بات ہوئی؟“

”یہی تو اہم بات ہے اماں!“ پارونے زور دیا۔

”جی پوچھو تو ہم دونوں ہی بڑا پیار کرتے تھے ملک جی غصے کا نام بھی نہیں جانتے پر میں بڑی چھیتی غصہ کر جاتی تھی اس لئے وہی مجھے مناتے تھے اور جب میں نہیں مانتی تھی تو وہ اندر باہر چپ چاپ پھرتے رہتے تھے پھر قمری آپا صلح صفائی کرواتی تھیں اس لئے ہمارے پیار و محبت میں قمری آپا بھی شامل ہیں۔“ اماں کی بات پارونے مکمل دلچسپی سے سنی تھی۔

”یعنی زیادہ پیار دیتا ہی کرتے تھے؟“ پارو کی بات پہ اماں نے کسی اور ہی رنگ میں چونک کر دیکھا ان کا دھیان آڑ میر کی طرف چلا گیا تھا۔

”نہ پتر زیادہ پیار مرد بھی اسی وقت تک کرتا ہے جب تک اس کی بات ماننی رہو اور اسے غصہ نہ دلاؤ، جہاں بات نہ مانی اور مرد کو غصہ آ گیا کھوسا را پیار محبت ہوا ہو گیا یوں کھوسو مرد مطلب سے پیار کرتا ہے اور عورت بغیر مطلب کے۔“ اماں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اسے تھوڑا سمجھانے کی سعی کی ابھی نجانے یہ گفتگو کیا رخ اختیار کرتی محلے کی دو خواتین آگئیں اور پارو اٹھ کر سبزی بنانے چلی گئی۔



شام کا پنچھی گاؤں کی کچی پکی دیواروں لہلاتے سرسبز کھیتوں اور گنگناتے درختوں پہ اپنے سرمئی پروں کا سایہ پھیلا چکا تھا کہیں سے خوشبو دار ہنڈیا کی مہک اور کہیں سے روٹیاں بناتے ہاتھوں میں پڑی چوڑیوں کی کھنک اٹھ رہی تھی کوئی ماں اپنے بچے کو آوازیں دے کر شام ہونے پہ گھر بلا رہی تھی اور کوئی بچہ ماں کا آچل تھامے بھوک پہ بے صبری کا اظہار کر رہا تھا پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں اپنی جگہ سیٹ کرتے ہوئے شور مچا رہے تھے اور کوئی اپنی جگہ چھن جانے پہ واویلا کرتے ہوئے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا ایسے میں مؤذن کی پکار پہ پورے ماحول پہ ایک سکون بھرا سنا چھا گیا کئی لڑکیوں بالیوں نے بے اختیار دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھا کر سر ڈھانپ کر اس پکار کو عقیدت سے سنا کئی مردانہ قدم مسجدوں کی طرف اٹھنے لگے اور کئی عورتیں وضو کرنے چل دیں۔

انہنائی خاموش بیٹھی پارونے ابا کو نماز کے لئے گھر سے نکلتے دیکھا پھر نظر اماں کی طرف اٹھی وہ بھی مرغیوں کا ڈر یا بند کر کے وضو کرنے جا رہی تھیں۔ چڑیوں اور کوؤں کے شور میں اب خاموشی اتر چکی تھی سب کو غم ہو گیا کہ ایک دن تمام ہو چکا ہے اللہ کا شکر ادا کرنے کی گھڑی ہے سو کبھی اس کے حضور جھکتے جا رہے تھے بے اختیار پارو کے قدم بھی غسل خانے کی جانب بڑھنے لگے تھوڑی دیر بعد وہ نماز پڑھ کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا رہی تھی جب باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

”آؤ میر آیا ہے؟“ بے اختیار اماں خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں پارو آواز سن چکی تھی مگر اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی وہ هنوز دعا کی حالت میں بیٹھی رہی اماں نے جلدی جلدی پچھواڑے کا کام کرنے والی نسرین کو دروازے کی چابی دے کر بھیجا کلڑی کے گیٹ سے پچھاتی ہوئی لینڈ کروزر اندر داخل ہوئی۔

”اس کو دوسری سائڈ پہ باندھ آؤ یہ گاڑی خراب بھی کر سکتی ہے۔“ اس نے گاڑی سے اترتے ہی گیٹ کے قریب بندھی بڑے بڑے سیٹوں والی بھینس کو بے زاری سے دیکھا۔

”اسے ہی کھولنے آئی تھی ملک جی ابھی لے جاتی ہوں۔“ نسرین نے جھک کر بھینس کو کھولنے سے کھولا اور گھر کے رہائشی حصے کی سائیڈ سے گزر کر پچھواڑے میں لے گئی جہاں بھینسوں بکریوں اور دوسرے پالتو جانور رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جس کو دیہاتی زبان میں ٹھارا بولتے تھے۔ آؤ میر نے قریب آکر اماں کو سلام کیا ان کے دل میں بے پناہ خفگی تھی مگر بیٹے کو سامنے جھکے دیکھ کر خفگی برقرار نہ رکھ پائیں اور انتہائی نرمی اور پیار سے اس کے ماتھے پہ یوسہ دیا۔

”جیتے رہو۔“ اسے دعائیں دیتیں وہ ممتا کے احساس سے مغلوب تھیں۔ آخر اتنے دنوں بعد بیٹے کو دیکھ رہی تھی البتہ چارپائی پہ بیٹھے ہوئے آؤ میر کی بے ارادہ نظر برآمدے کی طرف اٹھ گئی جہاں وہ جائے نماز بچھائے نماز کے بعد دعا کر رہی تھی۔ اس نے دوسرے لمحے نظروں کا زاویہ بدل ڈالا اسے اس کو دیکھنے کا کوئی شوق بھی تو نہیں تھا۔

”پارو پتر جلدی سے ٹھنڈا شربت لے کر آؤ اور پتکھا بھی چلا دے بڑی گرمی ہے۔“ وہ آؤ میر کے سامنے والی چارپائی پہ بیٹھ چکی تھیں۔

”نہیں اماں شربت نہیں سادہ پانی چاہئے۔“ اس نے روک دیا۔

پارو سن چکی تھی اس لئے برآمدے میں رکھی فریج سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی جو انتہائی خاموشی سے اس کی سمت بڑھا دیا تھا نہ دعا تہ سلام۔ اماں تو پارو کے پانی لانے سے قبل ہی وہاں سے غائب ہو چکی تھیں کہ نسرین ابھی تک دودھ لے کر نہیں آئی لیکن اماں جن کے لئے غائب ہوئی تھیں وہ جذباتی طور پر خود غائب تھے ان میں فی الحال ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا جو ان کو جذباتی طریقے سے ایک دوسرے کے قریب کرتا یا پھر شادی کے بعد پہلی بار ملاقات ہونے پہ کچھ انوکھا سا اچھوتا سا احساس دلانا دونوں طرف لائق اور بے نیازی عروج پہ تھی۔

اس کے ہاتھ سے گلاس تھامتے ہوئے بھی آؤ میر نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور وہ بھی لا پرواہی سے کھڑی گلاس خالی ہوتے ہی الٹے قدموں لوٹ گئی تھوڑی دیر بعد گھر میں کچھ چہل پہل سی ہونے لگی۔

ابا نماز پڑھ کے آچکے تھے چچا قدیر کو آؤ میر کی آمد کا پتہ چلا تو وہ بھی ملنے چلے آئے، چچی زہرہ بھلا کیوں پیچھے رہیں ایسے میں پارو کو احساس ہوا کہ دیوار پار سے بھی کسی نے آؤ میر کی آمد کو ”دیکھ“ کیا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد کافی دیر یونہی صحن میں محفل لگی رہی البتہ پارو ان لوگوں کو چائے دے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی گرمی کا احساس کافی تھا لیکن وہ کمرے سے باہر سونے کی عادی نہیں تھی اسی لئے تین چار روز قبل ملک ضمیر حیات اس کے لئے روم کولر لے آئے تھے پارو کے ان ناز و

اٹھائے جانے پہ ماہین نے کافی ناک بھوں چڑھائی تھی۔

”اب ایسی بھی کیا نازک مزاجی کی صحن میں نہ سویا جاسکے ہم بھی تو سوتے ہیں ہونہہ فضول میں آٹھ دس ہزار روپیہ خرچ کروانا ضروری تھا؟“ پارو اسے جواب کیا دیتی تا خود ہی بول پڑے۔

”جب گھریا رہی اس کا ہے تو پھر آٹھ دس ہزار کیا اہمیت رکھتے ہیں۔“ جس پہ ماہین مزید جل کر رہ گئی۔۔۔۔۔
 ”میرا آسانی سوٹ کہاں ہے؟“ بے حد تھکے۔۔۔۔۔ بے زار اور برہم لہجے میں پوچھا گیا اور غنودگی میں اتری پارو یکدم چونک کر بے دار ہوئی
 آٹھ میرا ماری کھولے کھڑا تھا۔ پارو کی نا سمجھ سوالیہ نظریں دیکھ کر اور تلملایا۔

”محترمہ! میں پوچھ رہا ہوں میرا آسانی رنگ کا سوٹ کہاں ہے اگر ہوش و حواس مکمل ہیں تو بتا دیں تاکہ میں کپڑے بدل سکوں۔“ لہجے کی کاٹ میں اضافہ ہو چکا تھا۔ پارو نے اس کا سوٹ نچلے خانے میں تیر کر کے رکھا ہوا تھا اس لئے خود ہی بیڈ سے اتر آئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پارو آگے بڑھ کر الماری سے سوٹ نکالنے لگی بے زاری کے عالم میں آٹھ میر نے اس کی پشت کو گھورا مگر چونک گیا سیاہ بالوں کی موٹی سی چوٹی ناگن کی طرح نازک کمر پہ چھول رہی تھی اس کی نظر دراز چوٹی کو چھوتے ہوئے اس کی گردن اور کندھوں تک چلی گئی دو پٹہ شانوں پہ تھا البتہ سر سے ڈھلکا ہوا تھا۔ نچلے خانے سے سوٹ نکالنے کے لئے وہ جھکی اور چوٹی بل کھا کر شانے سے گزر کے نیچے جا گری۔
 ”یہ لیجئے۔“

وہ یکدم پلٹی تو آٹھ میر یکدم شپٹا گیا۔ نگاہ بڑھ کر اکر رہ گئی تھی سوٹ لے کر تیزی سے کمرے سے چلا گیا تھا اندر ہی اندر اپنے آپ کو جھڑک دیا کہ پارو کو اس طرح دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی میرے لئے پہلا اور آخری حسن صرف ریٹا کا ہی تھا باقی ساری دنیا کی خوب صورتی میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی اور میرے دل میں اب کوئی حسن کوئی خوبصورتی اور کوئی جذبہ نہیں پنپ سکتا۔۔۔۔۔ وہ اپنے آپ کو ہدایت دے کر اور مضبوط کر کے دوبارہ کمرے میں آیا تھا اب کی بار وہ سچ سچ گہری نیند سو رہی تھی آہٹ پہ بھی بے دار نہ ہوئی۔

صبح صبح وہ نہانے کے بعد زمینوں کی طرف نکل گیا تھا واپس آیا تو اماں ناشتا بنا رہی تھیں اور پارو دودھ بلونے میں مصروف تھی انتہائی اہمک سے اپنے کام میں مصروف پارو کو دیکھ کر آٹھ میر کو حیرت ہوئی وہ پارو کے انداز اطوار دیکھ کر قدم قدم پہ چونک رہا تھا اسے پل پل حیرت کا سامنا تھا پارو اور ایسے کام کرے؟ ناممکن سامر حلہ تھا لیکن پھر بھی طے ہو رہا تھا پارو ایسے کام کر رہی تھی۔ مدھانی سے مکھن نکال کر وہ ایک پیالے میں رکھتی جا رہی تھی اور مکھن نکالتے ہوئے اس کی انگلیاں بھی مکھن کی ہم رنگ لگ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد آٹھ میر کا ناشتا تیار تھا تازہ تازہ پراٹھے اور تازہ نکالا گیا مکھن ٹھنڈی ٹھارہی کی لسی، وہ اتنا ہیوی ناشتا نہیں کرتا تھا مگر جب اماں اصرار کرتیں تو انکار کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا اسی لئے مجبوراً کھانا پڑتا تھا لسی اور پراٹھے پہ موجود مکھن کھاتے ہوئے بے اختیار آٹھ میر کی نگاہوں میں تھوڑی دیر پہلے کا منظر گھوم گیا جب پارو اس مکھن کو انگلیوں سے نکال کر جمع کر رہی تھی بے ساختہ ہی آٹھ میر کے منہ میں مکھن کے ساتھ ایک اور ذائقہ اتر آیا نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مکھن کی جگہ اس کے ہاتھوں کا ذائقہ محسوس ہونے لگا لسی کا گلاس ختم ہو گیا پراٹھا بھی ختم ہو گیا مگر اس مکھن میں

رہے ذائقے کا احساس ختم نہ ہوا آخر وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا تب تک مابین بھی آپجی تھی۔

”کیسے ہوا آؤ میر؟“ وہ آؤ میر سے ایک سال ہی چھوٹی تھی اس لئے برابری اور بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی تھی۔

”ٹھیک ہوں آپ سنائیں کہاں ہوتی ہیں؟“ آؤ میر ہمیشہ اسے احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

”میں تو نہیں ہوتی ہوں البتہ تم یہاں نہیں ہوتے۔“

ماہین نے ناشتے کے برتن سمیٹتی پار کو استہرائیہ نظروں سے دیکھا۔

”بس آج کل کی مصروفیت ہے پھر میں بھی فارغ ہو جاؤں گا سفر کیسا ہے کوئی پیغام آیا؟“ اسفر، مابین سے بڑا تھا اور آرمی میں آفیسر تھا

آج کل انک چھاؤنی میں تعینات تھا اس لئے ویک اینڈ پہ آنا بھی ذرا مشکل ہوتا تھا یوں اسفر اور آؤ میر کی ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی کیونکہ آؤ میر بھی اکثر شہر میں اپنے بزنس کے چکروں میں الجھا رہتا تھا۔

”ہاں چند دنوں تک آنے کا کہہ رہا تھا اور ہم سوچ رہے ہیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کا گھر لے آئیں۔“

ماہین بات کو طول دے رہی تھی جبکہ آؤ میر گھڑی دیکھتا ہوا کہیں جانے کا ارادہ باندھ رہا تھا۔

”اچھا مابین اللہ حافظ مجھے ساتھ والے گاؤں اپنے دوست سے ملنے جانا ہے۔“ وہ آخر میں الوداعی الفاظ بولتا آگے بڑھ گیا تھا اور مابین رسوئی کی چوکت میں کھڑی پار کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”کیسی ہو پارو؟“ مابین نے اس کے سراپے پہ ناقدانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں الحمد للہ آپ آج کدھر راستہ بھول گئیں دیوار کی بجائے سیدھے رستے کو زحمت دے ڈالی۔“ پارو..... دل و نگاہ کے

معاملے میں خاصی باریک بین تھی۔ مابین کی چال سے ہی وہ اس کے چلن کا اندازہ بخوبی کر چکی تھی۔

”وہ مجھے لے لیتی تھی ہماری چائی (کنورے) میں ملی منہ مار گئی ہے۔“ اس نے بہانہ کیا۔

”پہلی بار مار کے گئی ہے یا پھر پہلے بھی مارتی تھی.....؟ ارے چائی میں منہ!“ مابین کے چونک کر دیکھنے پہ پارو نے لاپرواہی سے ہلکی سی وضاحت بھی دی اس کے انداز میں نجائے کیا تھا کہ مابین جل کے رہ گئی اور پاؤں پٹختی ہوئی لسی لے کر چلی گئی تھی اور وہ اماں کے ساتھ دوپہر کے کھانے کا پوچھنے چل دی۔

اماں صحن کے ایک کونے میں لگے نیم کے درخت کے نیچے چار پائی بچھائے بیٹھی تھیں قریب ہی مرغیاں بطخیں اور بکریاں بھی محفل جمائے

ہوئے تھیں۔



آؤ میر کو پہلے بھی ایک دوبار احساس ہو چکا تھا کہ پارو اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہے پر سوں تو یہ لینے کی غرض سے وہ صحن میں

کھڑی پارو کے قریب آیا تو وہ یکدم بدک کے دور ہوئی تھی حالانکہ وہ ری پہ لٹکے تو لئے کو اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا اسے پارو کی حرکت پہ

حیرت تو ہوئی مگر سمجھ نہ آئی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل جاتی اس وقت بھی وہ تھک ہار کے بیڈ پہ دراز ہوا تو ایک سائینڈ پہ لیٹی پارو یکدم کھسک کے کچھ دور ہوئی تھی جس پہ بے اختیار آؤ میر کا سارا دھیان اس کی طرف مڑ گیا (میں خود تمہارے قریب نہیں آتا ورنہ مجھ سے دور جانے والی تم کون ہوتی ہو؟) اس نے نخوت سے سوچا اور ایک نظر پارو پہ ڈالی اس کی طرف پشت تھی۔ آؤ میر نے یکدم اس کی کمر میں بازو ڈال کے جھٹکے سے گھما کر اسے اپنے سامنے اور قریب کر لیا تھا وہ اس اچانک افتاد پہ چکرا گئی تھی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہارے قریب آتا ہوں اور تم دور ہو کر مجھے تڑپا رہی ہو؟“ آؤ میر کے لہجے میں طنز، کاٹ اور غصہ بدرجہ اتم موجود تھا پارو اس کے بازو میں اتنی سختی سے جکڑی تھی کہ تکلیف کا احساس اس احساس پہ حاوی ہو گیا کہ وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ غصے میں بولتے آؤ میر کی سانسیں پارو کے رخساروں کو چھو گئیں۔

”ملک صاحب آپ خود تڑپ رہے ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ تڑپ ہی تو ہے جو آپ کو اس وقت بھی تڑپا رہی ہے اس تڑپ کو روکنا آپ کا کام ہے میرا تو نہیں۔“ آؤ میر نفرت آمیز اظہار پہ اتر آیا تھا۔

”ہونہر تڑپ! محترم ماہ پیکر تم کبھی مس ورلڈین کے بھی آ جاؤ تو میرے دل پہ اثر نہیں کر سکتیں مجھے نفرت ہے تمہاری صورت سے اس گھر میں اگر تم دکھائی دے رہی ہو تو صرف میری عنایت سے اماں کی ہزاروں منتوں کے بعد تمہیں یہاں آنے کی اجازت دی گئی ہے سمجھیں تم؟ کیونکہ تم تمہارا یہ وجود اور تمہاری باتیں میرے لئے رقی برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے.....“

”ملک صاحب میں آپ کے کھوکھلے اور مردہ دل پہ اثر کرنا بھی نہیں چاہتی اور جتنی نفرت آپ مجھ سے کرتے ہیں اس سے دس گنا زیادہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں اور ہاں ایک بات یاد رکھئے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب آپ اس گھر میں صرف میری وجہ سے میری عنایت سے نظر آئیں گے تب کھیل میرا ہوگا اور اماں آپ کو لانے کی منتیں بھی نہیں کرے گی کیونکہ آپ، آپ کا یہ وجود اور آپ کی باتیں میرے لئے ہی نہیں کسی کے لئے بھی اہمیت نہیں رکھیں گے سمجھے آپ؟“ وہ اس سے زیادہ نخوت سے کہتی جھٹکے سے دور ہو گئی تھی اور آؤ میر نے تھملا کر غصے سے اپنا ہی موبائل دیوار پہ دے مارا تھا۔

اس جھڑپ کے بعد پارو کے دل و دماغ میں آؤ میر کے خلاف شیطانی ارادے بننے لگے۔

کیونکہ آج تک اس نے آؤ میر کو نہ ستایا تھا اور نہ ہی تڑپایا تھا اگر وہ ستانے یا تڑپانے کا ارادہ باندھ لیتی تو یقیناً آؤ میر کو نا کھونچنے چھو سکتی تھی اس میں مقابل کو زچ کرنے کے ایک سو ایک حربے اور صلاحیت موجود تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس صلاحیت کو ایک بار ضرور بروئے کار لا کر دیکھنا چاہئے مگر اتنا کہ کسی اور کو بھی خبر نہ ہو سکے اور ملک آؤ میر حیات بے بسی سے الجھ کر رہ جائے اور اس کام کے لئے اب اسے نئے انداز سے سوچنا تھا کیونکہ اب اس نے ملک آؤ میر سے بھگانا نہیں تھا ورنہ وہ کمر مقابلہ کرنا تھا نفرت میں شانہ بشانہ قدم اٹھانے تھے جس کے لئے اسے کافی سے زیادہ اسٹیمنا جمع کرنے کی ضرورت تھی اور وہ یہی کر رہی تھی اور اس کی شروعات بھی آج ہی ہو گئی تھی۔

خوش قسمتی سے پارو کے گاؤں سے اس کی سہیلی شنو آگئی اور پارو اچانک شنو کو اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے چیخ اٹھی۔

”شنو تو یہاں۔“ دونوں بے تابانی سے گلے ملیں اور کمرے سے نکلنے آؤ میر نے دو سہیلیوں کی بے تابانی اور بے پناہ اپنائیت کا منظر دیکھا۔

”آج ابا اپنے دوست کے گھر آ رہا تھا میں نے سوچا ہماری پارو کا گھر بھی تو اسی گاؤں میں ہے پھر ابے سے تھوڑی اڑی کی اور ابا مان گیا۔“ شنو نے اپنے آنے کا قصہ بتایا پھر آٹھ میر کو دیکھ کر سنبھل گئی۔

”سلام ملک جی۔“ اس نے انتہائی تمیز کا مظاہرہ کیا۔ وہ سلام کا جواب دے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں اماں ابا کا قیام ہوتا تھا۔

”پارو خیر تو ہے؟“ شنو نے انداز بدل کے خیر پوچھی۔

”شنو خیر تو اب میں کروں گی دیکھنا اس ملک صاحب کا حال کیا ہوتا ہے؟“ اس نے مبہم سے انداز میں کہا پھر شنو کو لے کر کمرے میں آ گئی۔

”چاچا نہیں آیا یہاں؟“ پارو نے شنو کے ابے کا پوچھا۔

”جلدی میں تھا تیرے دروازے پہ چھوڑ گیا واپسی پدائے گا وہ بھی تجھے یاد کر رہا تھا۔“

اماں اور بہنوں کی خیر خیریت پوچھنے کے بعد ان لوگوں کی باتیں شروع ہو گئیں نسرین کے ہاتھ اماں نے کھانے پینے کی کافی اشیاء بھجوائی تھیں اور کھانے کی تیاری بھی شروع کر دی آخر پارو کی سہیلی آئی تھی اور وہ بھی اس کے گاؤں سے اس لئے خصوصی خاطر تو وضع تھی۔ آٹھ میر کو اماں کا یہ ہر قدم پہ پارو کے لئے بچھ بچھ جانا سخت زہر لگ رہا تھا اور اسی لئے ناگواریت اس کے چہرے کو دیکھتے ہی محسوس ہو رہی تھی اوپر سے کمرہ پارو اور شنو کے قبضے میں تھا جس سے مسلسل ہلکھلاہٹوں کی آواز اور مبہم سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کافی دیر بعد پارو کسی چیز کے لئے باہر نکلی اور آٹھ میر تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

”اپنی سہیلی کو کسی دوسرے کمرے میں لے جاؤ مجھے آرام کرنا ہے۔“

”دیکھا اماں ملک صاحب کیا کہہ رہے ہیں اپنی سہیلی کو کمرے سے نکال دوں ان کو آرام کرنا ہے۔“ پارو نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اماں کو درمیان میں گھسیٹ لیا اور آٹھ میر شٹا گیا۔

”ہائیں؟ یہ کیا طریقہ ہوا مہمان نوازی کا؟“ اماں تو پہلے ہی پارو کے ساتھ ساتھ اس کے پورے گاؤں پہ فریفتہ تھیں یہ بات سنتے ہی آٹھ میر کی طرف مڑیں اور آٹھ میر تازہ تازہ کٹے ہوئے تربوز کی ٹرے اٹھا کر لے جاتی پارو کو دیکھ کر سر تا پا غصے سے جھنجھٹا اٹھا تھا کیونکہ اس کے لبوں پہ دھیمی دھیمی مسکان تھی۔

پارو نے پلان تو بہت بنائے تھے مگر ان پر عمل درآمد نہ کر سکی کیونکہ دو روز بعد ہی آٹھ میر شہر چلا گیا تھا اس کا پارٹنر دینی جا رہا تھا اس لئے بزنس کا سارا کام کچھ عرصہ اسی نے سنبھالنا تھا اور آٹھ میر جو گاؤں آ کر ٹینشن کا شکار ہو چکا تھا گاؤں سے نکلتے ہی آزاد اور ہلکا پھلکا ہو گیا اسے اس پارو پہ غضب کا غصہ تھا۔ اختیار میں ہوتا تو وہ پارو کو مار مار کر اس کے چودہ طبق روشن کر دیتا مگر مسئلہ تھا کہ اماں آٹھ میر آ جاتی تھیں۔

”آٹھ میر کو شہر آ کر بھی پارو کی لگائی آگ چین نہیں لینے دے رہی تھی وہ جو ہر وقت رینا کے خیالوں اور یادوں میں گم رہتے ہوئے زندگی بسر کر رہا تھا اب اس پہ پارو کا مجھوت سوار ہو چکا تھا وہ اسے عجیب عجیب رنگ برنگی چوٹیں لگاتی تھی اب تو نیا طریقہ اپنا رکھا تھا فٹ اماں ابا کو معاملے میں گھسیٹ لیتی اور آٹھ میر کو ستا کر خود سکون سے سائیڈ پہ ہو جاتی ایسے میں وہ بس ہاتھ مسل کے رہ جاتا تھا۔



”یار کیا بات ہے کچھ آپ سیٹ کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو کیا بھابی کو چھوڑ کے آنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا؟“ اس کے دوست نے اسے چھیڑا تو آٹھ میریکدم سنبھل گیا۔

”یار ایسی کوئی بات نہیں میں کام کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

”جھوٹ تو مت بولو بھابی کا نام اب تم نے کام رکھ دیا ہے۔“ اس کا یہ دوست دانش انصاری کافی شرارتی اور قریبی دوست تھا۔ اس لئے یہ چھیڑ چھاڑ بھی چلتی تھی۔

”بکواس مت کرو یہ بتاؤ تمہاری فلائٹ کب ہے؟ آٹھ میرے سر جھٹک کر تمام توجہ دانش پہ مرکوز کر رکھی تھی اور دانش اپنے جانے کے متعلق معلومات فراہم کرنے لگا۔

جون، جولائی کی دوپہریں اور دن کی دھوپ اور گرمی کے اثرات سے تپتی سلگتی شاہیں، چاندنی کی ٹھنڈک اور کبھی کبھی لودیتی ہوا میں اس نے اس ایک آگن میں اکیلے بتائیں وہ ایسا گیا کہ ایک بار بھی پلٹنے کا نہیں سوچا تھا کبھی کبھی پارو اپنے مزاج سے ہٹ کر سوچتی تو اسے ہول اٹھنے لگتے تھے جی چاہتا کہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر اجاڑ ویران کر کے یہاں سے چلی جائے مگر جاتی کہاں؟ جہاں اللہ اناتو اس ماں ایک بیٹی کی طلاق کا غم سینے سے لگائے بیٹھی تھی؟ جہاں اس کے جانے سے مزید دکھوں میں اضافہ ہو جاتا؟ اسی لئے وہ اپنے آپ سے اور ملک آٹھ میرے مقابلہ کرتی پھر رہی تھی مگر وہ تو مقابلہ کرنے سے پہلے ہی میدان سے جا چکا تھا اس لئے پارو میدان کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی مخالف پارٹی کا انتظار کر رہی تھی اور اس انتظار میں کھیل کے موسم بیتے جا رہے تھے۔

درد و یار پہ اترنے والی دھوپ کی چال بدل رہی تھی صحن میں بکھرنے والے سائے رنگ بدل رہے تھے۔ خالہ، خالو کے کندھے شکستہ لگتے گئے تھے مابین کی باتیں بڑھ چکی تھیں اور پارو سب کو بہلا بہلا کر ٹھنڈے لگی تھی خالہ کو تسلیاں دیتی خالو کو سمجھاتی مابین کے سامنے ناک کرتی اور اپنی ماں بہنوں اور سہیلیوں کے سامنے جھوٹ کہتے سچ بچ تھک چکی تھی اس کا بس چلتا تو وہ ایک بار ملک آٹھ میر حیات کا گریبان پکڑ کر اتنا ضرور پوچھتی کہ کون سے جنم میں میرے دشمن بنے تھے جس کا بدلہ تم مجھ سے ہی نہیں اپنے ماں باپ سے بھی لے رہے ہو پھر بھی تمہارا دل نہیں بھر رہا۔ لیکن کاش وہ ایسا کر سکتی وہ ایک بار سامنے تو آتا۔ نجانے نہ آنے کی قسم کھا کر گیا تھا پھر کوئی قسم اسے کھا گئی تھی۔ کچھ خبر نہیں ہو رہی تھی۔

”ملک جی اپنے بیٹے سے کہہ دینا اس معصوم بچی کو برباد کرنے کی بجائے آزاد کر دے۔“ ملک قریبی پی سی او سے آٹھ میر کو فون کرنے جا رہے تھے جب دل پہ ہزاروں من کا پتھر رکھتے ہوئے اماں نے یہ جملہ کہا تھا اور ضمیر حیات نے بھی یہی جملہ من و عن فون پہ آٹھ میر سے کہہ دیا اس کے جواب میں آٹھ میر نے کیا کہا اماں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ دن بھر اس اور ملول رہتی تھیں پارو نے بارہا اس اداسی میں مداخلت کی مگر اماں یونہی چاپ چاپ منہ سرپیٹے پڑی رہی اماں کی کسلمندی دیکھ کر ہاتھ بھی کوئی بات نہ چھیڑی۔

شام کو موسم ابر آلود ہو گئے۔

نومبر کی دم توڑتی نبضیں ماحول کو بخیر بستہ کر رہی تھیں وہ چائے بنا کر ان کے پاس ہی آ بیٹھی آگ دہکائے بیٹھے تھے اور اماں لحاف میں

دیکھی ہوئی تھیں۔

”اماں سرد یادوں؟“

”ارے پتر بھئی کئی ہوں دن رات ویلی (فارغ) رہتی ہوں بیمار بھی نہیں ہوتی سر کیوں دبائے گی بھلا؟“ آڑ میر کی وجہ سے ہونے والی فحاشی کسی طور تو ٹکٹا ہی تھی۔ پارو نے بے بسی سے ابا کو دیکھا وہ بھی کچھ نہ بولے۔

”دیکھ پتر دن بھر اتنا کام کرتی ہے اس وقت بھی پاؤں یا سردبا کے سوئی ہے یہ سب کر کے تجھے بھی تو تھکن ہوتی ہوگی شایاں جا کر خود آرام کر دو جاؤ ہم ٹھیک ہیں۔“

”پر ابا اماں مجھ سے کیوں ناراض ہوتی ہے؟“ پارو روہاںسی ہو گئی۔

”اس لئے کہ تجھ سے اتنا پیار جو کرتی ہے۔“

انہوں نے مسکرا کر اس کا سر تھپکا اور اسے سونے کے لئے بھیج دیا مگر کافی دیر پارو ستون کے پاس کھڑی رہی، بارش کی بوندیں کچے صحن میں جذب ہوئیں تو مٹی کی خوشبو رگ میں اتر کر مسکور کرنے لگی۔ پارو اس کچی مٹی کی مہک دل میں چھپائے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔



رات کا نجانے کونسا پر تھا جب گہری نیند سوئے دماغ پہ ٹھک ٹھک کر آواز ایک یو جھ سا ڈالنے لگی تھی اور غنودگی میں حیات بمشکل رفتہ رفتہ بے دار ہوئیں اور پارو یکدم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی کوئی دستک کے ساتھ ساتھ اسے پکار بھی رہا تھا۔

”پارو پتر اٹھ باہر کوئی دروازہ بجا رہا ہے۔“ یہ آواز یقیناً اماں کی تھی پارو فوراً لپکی اور دروازہ کھول دیا اماں باہر برآمدے میں کھڑی تھی پارو نے متفکر نظروں سے دیکھا باہر طوفانی بارش نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی بجلی بھی کڑک رہی تھی اور بادلوں کی گرج بھی سونے پہ سہاگہ تھی وہ پلٹ کر اندر آئی جوتے پہنے دوپٹہ اوڑھا اور دوبارہ باہر آگئی سرد ہوا چل رہی تھی۔ بجلی اور بادلوں کی گرج نے الگ ماحول میں خوف بھر دیا تھا بمشکل پارو ڈیوڑھی کے لکڑی کے گیٹ تک پہنچی۔

”کون ہے؟“ اس نے کپکپاتے ہوئے پوچھا اس کی دھیمی آواز اس شور ہنگامے میں اپنا وجود نہ منواسکی۔

”کون ہے؟“ اب کی بار دروازے کے بے حد قریب آ کے بلند آواز سے تقریباً چیخ کر پوچھا گیا۔

”دروازہ کھولو میں ہوں۔“ پارو حیرت سے کھڑی رہ گئی۔ آڑ میر حیات اور اس وقت اس موسم میں اور اتنی رات گئے؟ حیرت تو فطری عمل تھا مگر یہ عمل کچھ زیادہ طویل ہو گیا تھا جب ہی آڑ میر نے تلملا کر دروازہ پیٹ ڈالا اور پارو نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

”مر گئے تھے سب کے سب؟“ وہ اندر قدم رکھتے ہوئے دھاڑا وہ بے ساختہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہو گئی وہ سر تا پا بارش میں بھیگا ہوا تھا اور نجانے کب سے دروازہ بجا رہا تھا جس کی وجہ سے اب پارو ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا وہ اس پہ ایک نگاہ غلط بھی ڈالے بنا آگے بڑھ گیا تھا اور پارو جوں کی توں کھڑی لمبے لمبے ڈگ بھر کے صحن عبور کرتے آڑ میر کی پشت دیکھ کے رہ گئی۔

برآمدے میں کھڑی اماں آڑ میر کو اتنے مہینوں بعد غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے چمک اٹھیں البتہ ابھی بے دار ہو چکے تھے وہ بے دلی سے گیٹ بند کرنے لگی اور ست قدموں سے چلتی واپس آگئی۔ مگر بارش نے صحن کراس کرتے ہوئے دوبارہ اسے بھگونے میں کوئی کسر نہ چھوڑی پاروسیدھی اپنے کمرے میں آئی تھی وہ بھی پوری بیگی ہوئی تھی اس لئے اب کپڑے بدلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس نے بھیگا ہوا دوپٹہ اتار کر سائیڈ پر رکھا اور چہرے سے پانی صاف کرتے ہوئے الماری کھولنے لگی ابھی وہ اپنے لئے کپڑے نکال ہی رہی تھی، جب آڑ میر بھی کچھ اسی حالت میں اندر داخل ہوا اور آگے پیچھے دیکھے بنا سیدھا الماری کی سمت آیا اور الماری کا پٹ بند کر کے مڑتی پارو چونک گئی البتہ آڑ میر کے قدم اپنی جگہ پر جم سے گئے تھے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ایسا نازک اور دھڑکتا منظر پہلی بار یوں رو برو سامنے آیا تھا کہ آڑ میر بھی نگاہیں پٹانا بھول گیا تھا اور پارو اپنے سامنے اور اتنے قریب کھڑے آڑ میر کے سامنے سے ہٹنے کے لئے راستہ تلاش رہ گئی بوکھلاہٹ میں اپنا آپ چھپائے نہیں چھپ رہا تھا اور اسی بوکھلاہٹ میں ہی وہ آڑ میر کا کندھا دھکیل کے سائیڈ سے گزر گئی لیکن ہوش رہا احساس پورے کمرے میں چھوڑ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کے لئے چائے لے کر آئی تو کپڑے تبدیل کر کے دوپٹہ بھی ٹھیک کر کے اوڑھ چکی تھی وہ بھی چیخ چکا تھا رسوئی بند کر کے جب تک وہ اپنے کمرے میں آئی بجلی اچانک روٹھ گئی بیڈ پر لیٹے آڑ میر نے لائٹر جلایا اور پارو نے چٹختی چڑھا دی اتنے میں وہ بھی لائٹر بجھا چکا تھا اور اتنے گھورا اندھیرے میں اندازے سے چلتی وہ بمشکل بیڈ کو ٹٹول پائی اس کا ہاتھ سیدھا آڑ میر پر جا پڑا۔

اور دوسرے پل آڑ میر کا ایک جھٹکا اس کے سارے توازن درہم برہم کر گیا تھا چند سیکنڈ بعد وہ سنبھلی مگر تب تک آڑ میر حصار مضبوط کر چکا تھا اور وہ جو پارو سے عمر بھر دور رہنے کی قسمیں کھائے بیٹھا تھا اتنے بڑے بڑے عہد باندھ رکھے تھے سب کے سب توڑتا چلا گیا اس وقت وہ اس کی بیوی اور اس کی ملکیت تھی جس پر اس کی مکمل دسترس تھی اور یہی احساس سرشاری اور مدھوشی کو مزید ہوا دے رہا تھا پارو آج اس کے حصار میں تھی۔



”پتر اتنی دیر سے کیوں آیا تھا؟“ اماں چائے پیتے آڑ میر کے قریب آ بیٹھیں وہ ناشتا کر کے اب چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رات کی طوفانی بارش نے سردی میں اضافہ کر دیا تھا مگر اس وقت بادلوں سے الجھ کر منظر عام پر آنے والے سورج کی کرنیں جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھیں جانوروں سے لے کر پودوں تک ہر چیز بیگی بیگی اور ٹھٹھری ٹھٹھری لگ رہی تھی لیکن اس کے برعکس ملک آڑ میر حیات کی بشاش طبیعت سے اس کے سکون کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”ساتھ والے گاؤں میں میرے ایک دوست کی شادی تھی شہر واپس جانے کے لئے دیر ہو گئی موسم بھی خراب تھا اس لئے ادھر چلا آیا لیکن گاؤں کے چوک میں ہی گاڑی کا ناز گڑھے میں پھنس گیا اس لئے گھر تک پیدل آنا پڑا۔“ وہ چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے انہیں جواب دیتا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کچھ دن رہے گا نا ادھر؟“ انہوں نے کافی آس بھری نظروں سے دیکھا۔

”کہہ نہیں سکتا کیونکہ آفس سنبھالنے والا کوئی نہیں ایک اعتبار کا منیجر ہے مگر وہ بھی کب تک کام کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔“ آڑ میر کا سر سری

سامندرا نہیں مایوس کرنے لگا۔

”تو پھر ایک کام کر پارو کو ساتھ لے کر اپنی خالہ (پارو کی اماں) کے گھر ہو آؤ اتنی بارتیراپوچھ چکی ہے اور پارو بھی اتنے دنوں سے نہیں گئی۔“ انہوں نے نیا آئیڈیا سوچا، دونوں کو تنہائی بخشے گا۔

<http://kitaabghar.com>

”معافی چاہتا ہوں اماں میں آج فارغ نہیں ہوں۔“

صاف کورا جواب دیتا وہ برآمدے سے نکل گیا اور رسوئی میں بیٹھی پارو سرتا پاسلگ اٹھی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ جاتی کب ہوں ملک صاحب۔“

انہوائی نخوت سے بڑبڑاتی وہ چولہے کے سامنے بیٹھی جلتی لکڑیوں سے اُلجھنے لگی گزشتہ شب اپنا ہر احتجاج بے سود ہوتا دیکھ کر اس کے دل میں اس وقت انکارے دکھ رہے تھے۔

لیکن آؤ میر کے خلاف جو غمیض و غضب اس کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا وہ اتنی آسانی اور جلدی ختم ہونے والا نہیں تھا دل ہی دل میں وہ پھر رہی تھی کہیں غبار جو نہیں نکل رہا تھا۔



شام کو آؤ میر گاڑی لے کر گھر آیا تھا لیکن والدین کی موجودگی کے باوجود گھر خالی خالی لگ رہا تھا اسے سمجھ نہ آیا کہ ایسا کیوں ہے مگر کچھ دیر بعد یہ احساس بھی کھل گیا کہ ایسا کیوں ہے۔

<http://kitaabghar.com>

”وہ چلی گئی ہے تو آپ لوگ اتنے چپ کیوں بیٹھے ہیں؟“ اسے خفگی ہوئی تھی۔

”ہائے کیوں نہ چپ ہوں پہلے اتنے مہینے تم گھر ہی نہ آئے اب آئے ہو تو وہ چلی گئی ہے ہمارا کیا ہے جو چاہے کرتے پھر.....“ آؤ بھر کر رہ گئیں اور وہ اماں کو دیکھنے لگا۔

گاؤں کے بڑے ملک کی بیوی تھیں زندگی میں سکھ و آرام بھی تھا اولاد بھی تھی کوئی دکھ تکلیف یا بیماری بھی نہ تھی پھر بھی وہ اتنی بوڑھی اور کمزور لگتی تھیں اور اس بڑھاپے کے اثرات آج کل کچھ زیادہ دکھائی دینے لگے تھے اور اس کا ذمہ دار کسی نہ کسی حد تک وہ خود تھا کیونکہ ان کی ہر خوشی غم اس کی ذات سے وابستہ تھے ان کی زندگی کا مرکز وہی تھا اور وہی ان کو پریشانیاں دیتا آ رہا تھا یہی سوچتے سوچتے اپنا آپ غلط لگنے لگا تھا پھر رینا سے کیا گیا وعدہ بھی دماغ میں تازہ ہونے لگا اس لئے ندامت بھی ہوئی مگر وقتی طور پر کیونکہ جہاں پارو کا خیال آ جاتا تھا وہاں وہ ہر ندامت بھول کر کیونہ پرور ہو جاتا تھا اسے پارو کا گھنٹڈی انداز طیش دلا دیتا تھا وہ اس کے نازک سراپے میں اکڑا کر دیکھتا تو غصے میں آ جاتا تھا لیکن اس وقت سچ چاہے وقتی ہی سہی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

”میں صبح اسے جا کر لے آؤں گا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور اماں کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔

”تو جائے گا لینے کے لئے؟“ دوبارہ پوچھا گیا تاکہ یقین ہو سکے۔

”جی میں ہی جاؤں گا۔“ اس نے یقین کی مہر لگاتے ہوئے باہر کی سمت قدم بڑھا دیئے اور اگلی صبح ان دونوں کی خوشیوں کا دن تھا انہوں نے فروٹ اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں منگوا رکھی تھیں۔ وہ پہلی بار سسرال جا رہا تھا اس لئے خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا تھا خود اسے ان باتوں کا بھلا کیا خیال تھا جو کچھ کرنا تھا انہوں نے ہی کرنا تھا اور اتنی چہل پہل کے باوجود آج بھی خاصی ادھوری لگ رہی تھی پارو کا وجود اس گھر کے لئے بے حد ضروری اور اہم ہو چکا تھا اس کے بغیر اب سب کچھ نامکمل تھا بارش کی وجہ سے کچی کچی سڑکوں پہ کچھڑ اور مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے بلیک چمکتی دکتی لینڈ کروزر مٹی مٹی ہو رہی تھی اور ڈرائیونگ بھی کافی احتیاط سے کرنا پڑ رہی تھی آدھے پون گھنٹے کی مسافت پورے ایک گھنٹے میں طے ہوئی اور وہ پارو کے گاؤں پہنچا تھا۔

”دیکھ پارو کسی کو بھی اتنی امید نہیں تھی کہ تو کسی کے ساتھ نبھا کرے گی پر تجھے اتنے مہینوں سے اپنے گھر میں خوش اور نباہ کرتے دیکھ کر سب ہی کو بڑی حیرانی ہوتی ہے تو یقین کر پارو تیری اماں تیرے لئے اتنی دعائیں کرتی ہے کہ میں حیران ہوتی ہوں پہلے وہ تجھے کتنا کستی تھی۔“ شنو چارپائی پہ لیٹی پارو کا سرد باتی ہوئی باتیں بھی کر رہی تھی۔

”چل ہٹ میری اماں مجھے کب کو سننے دیتی تھی بس میں اسے تنگ کرتی تھی اسی لئے تھوڑا گرمی کھا جاتی تھی.....“ پارو نے شنو کا ہاتھ اپنے ماتھے سے جھٹک دیا۔

”اچھا اب کسے تنگ کرتی ہے اپنے ملک صاحب کو۔“

”ارے نام مت لے اس ملک کے بچے کا، جی چاہتا ہے گولی مار دوں مر جانے کو.....“ پارو یکدم غرائی لیکن دوسرے پل خود پہ پڑنے والے سائے سے چونک گئی پارو سردی کی وجہ سے دھوپ میں چارپائی ڈال لے لیٹی ہوئی تھی اور سر ہانے شنو بیٹھی اس کا سرد بارہی تھی ایسے میں ان کی گفتگو بھی کراہی تھی جو آٹھ میر نے حرف بہ حرف سنی تھی اسی لئے مزید قریب آتے ہوئے گلا کھکا کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی پارو اور شنو دونوں کے بیک وقت رنگ اور حواس اڑ گئے تھے۔

”مم ملک جی آپ! السلام علیکم آج آپ کیسے؟“ شنو نے بے ربط سا سلام کیا اور بولنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی سر ڈھانپنے کی کوشش بھی جاری تھی البتہ پارو صرف اٹھ کر بیٹھی تھی کہا کچھ نہیں تھا۔

”وعلیکم السلام بیٹھو تم لوگ۔“ اس نے پارو پہ ایک سخت سی نگاہ ڈالی وہ چارپائی کے اوپر ہی دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ بیٹھی رہی سر جھکا ہوا اور دوپٹہ کندھے سے ڈھلک رہا تھا۔

”باقی سب کہاں ہیں؟“ شنو نے دوسری چارپائی قریب کھینچ کر اسے پیش کی تو آٹھ میر نے شنو سے ہی دریافت کر لیا۔

”مائی پارو کے لئے دوائی لینے گئی ہے..... اسے کل سے بخار ہے.....“ شنو نے بشکل بات مکمل کی اور پھر چائے کا کپہہ کر سوئی کی سمت چلی گئی۔

اتنے بڑے صحن میں تنہائی اور سناٹا تھا اور ان دونوں کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا، آٹھ میر نے گردن موڑ کر دو پارہ پارو کو دیکھا جو ہنوز اسی طرح بیٹھی تھی۔

”میں نے تو سنا تھا تم بارش میں بھینگنا اپنا فرض سمجھتی ہو لیکن ذرا سی بارش سے تم اس حال تک پہنچ جاؤ گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ اس کی بات پہ پارو نے سلگ کر اسے دیکھا۔

”میں بارش کی وجہ سے بیمار نہیں ہوئی۔“

”تو پھر کس وجہ سے بیمار ہوئی ہو؟“ برجستہ جواب کا برجستہ سوال اٹھا تھا پارو ٹپٹا گئی وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا
 ”مجھے کوئی خیند سے جگا دے، میری آنکھیں دکنے لگتی ہیں اس لئے مجھے بخار ہو جاتا ہے اس دن اماں نے دروازہ کھولنے کے لئے مجھے جگا دیا تھا اور.....“

”اماں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ دروازہ کھولنے کے بعد دوبارہ سونا مت.....“ آڑ میر نے اس کی بات کاٹ کے جن نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اس پہ پارو کا جسم آگ کی طرح تپنے لگا تھا بخار کی حد کر اس ہو چکی تھی اس کی خوبصورت موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی تھی اس نے ضبط کرتے ہوئے منھتیاں بھیج لیں۔ تب تک قمر النساء بھی گھر میں داخل ہو چکی تھیں اور شنو بھی چائے لے کر آ گئی۔ آڑ میر کو دیکھ کر اماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور اس خوشی میں اچانک ربیعہ اور اس کا شوہر بھی شریک ہو گیا تھا صفیہ، ربیعہ، اماں اور ربیعہ کا شوہر حماد بھی آڑ میر کو شادی کے بعد پہلی بار دیکھ کر کافی خوش ہوا تھا اماں نے کھانے کی تیاری کرنا چاہی تو اس نے روک دیا۔

”نہیں خالہ میں اسے لینے آیا ہوں کھانا ہم گھر جا کے کھائیں گے ویسے بھی ابھی بھوک نہیں ہے۔“ پارو نے اس کی آمد کا مقصد سنا تو تلملا اٹھی (میں جانتی ہوں کس دل سے لینے آئے ہو یقیناً اماں نے منتیں کر کے بھیجا ہو گا اتنے نیک تم خود کبھی ہو ہی نہیں سکتے) اسے غصہ آ رہا تھا پھر بھی مجبوراً چپ بی رہی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے تم کھانا کھائے بغیر چلے جاؤ بلکہ میں تو کہتی ہوں آج رات ہمارے پاس ہی رکو میرا دل بھی ٹھنڈا ہو گا کہ میرا بھانجا میرا پتر آیا ہے۔“ انہوں نے آڑ میر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور وہ اتنے اصرار پہ انکار نہیں کر سکا تھا اس لئے کھانے کی ہامی بھری البتہ رات وہ گھر ہی جانا چاہتا تھا اس عرصے میں پارو چپ چاپ بیٹھی رہی مگر ایک بات پہ بُری طرح چونک گئی تھی ربیعہ کا ڈیڑھ دو سالہ بیٹا کھیلتے کھیلتے آڑ میر کے قدموں کے پاس آ گیا تھا بجائے اس کے کہ وہ اسے پیار کرتا بھلاتا اس نے ناگواری سے یکدم اپنے قدم پیچھے کر لئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی ٹانگوں کو تھام کے سہارا لیتا کھڑا ہو گیا تھا.....

”ما..... ماں..... ماموں.....“ وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے آڑ میر کی گھٹنے پہ ہاتھ مار رہا تھا اور آڑ میر کی رنگت بدلتی جا رہی تھی ماتھے پر شکنوں کا جال اور چہرے پہ اذیت کا احساس تھا۔

”پلیز اسے ربیعہ کے پاس لے جاؤ۔“ اس نے بے اختیار حماد سے کہہ دیا اور پارو ٹھنک گئی۔ کیونکہ آڑ میر کے انداز میں ایک غیر معمولی احساس تھا ایسا احساس جس سے نفرت اور اذیت کا عکس دکھائی دے رہا تھا حماد سمجھا آڑ میر کپڑے خراب ہونے کے خیال سے کہہ رہا ہے اس لئے بچے کو اپنی سمت کھینچ لیا مگر بچے کا ذہن معصوم اور ضدی تھا اس لئے دوبارہ لپک کے اپنے ”اجنبی ماموں“ کے قریب آیا لیکن اب کی بار وہ مضطرب سا ہو

کے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

”حماد گاڑی میں کچھ سامان رکھا ہے وہ اتروانا ہے کسی کو بلا دو۔“ آؤ میر نے وہاں سے ہٹنے کا بہانہ کیا مگر پارو دم بخود بیٹھی یہ پتویشن سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پھر بھی سمجھ نہ پائی کہ آؤ میر حیات نے ایک بچے کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ حالانکہ حمزہ کافی گول مثول اور پیارا بچہ تھا پارو اکثر ملنے پہ اس کے ساتھ لگی رہتی تھی مگر آؤ میر نے تو حد کر دی تھی۔

واپسی پہ گاڑی میں دونوں طرف خاموشی ہی چھائی رہی آؤ میر آنے سے قبل ربیعہ اور صفیہ کو بطور کزن شاپنگ کے لئے کچھ رقم دے کر آیا تھا وہ دونوں توانکار کر رہی تھیں قمر النساء نے ہی رکھ لینے کا اشارہ کیا تھا مگر گاڑی کا لاک کھولتے کھولتے وہ پلٹ کر دوبارہ ربیعہ کے پاس گیا تھا۔

”یہ اپنے بچے کو شاپنگ کروادینا اس نے مجھے ماموں کہا ہے.....“ وہ کہہ کر رکنا نہیں اور ربیعہ ہاتھ میں پکڑے نوٹ دیکھتی رہ گئی یہ آؤ میر بھی بڑا عجیب ہے اتنا بے مروت ہو کر بھی بے مروت نہیں لگتا نہ جانے کیوں دور دور رہتا ہے؟“ وہ اس کی گاڑی کے اوجھل ہوتے ہی حیرت کا اظہار کر رہی تھیں اور پارو گاڑی میں بیٹھی اسی کے رویے کو سوچ رہی تھی جس نے حمزہ کو ہاتھ لگانا اور پیار کرنا گوارا نہیں کیا تھا.....



اس دفعہ آؤ میر کافی دن رہ کر واپس شہر گیا تھا اماں بھی اس دفعہ خوش تھیں البتہ پارو کا مزاج آؤ میر سے اکھڑا اکھڑا تھا شاید دسمبر کی سردی کا اثر تھا ہر چیز ہی بو جھل بو جھل سی تھی اماں گندم اور دالیں پیس کر نشاستہ بنانے میں مصروف تھیں اور پارو دن بھر کام نپٹانے کے بعد خاموشی سے لیٹی رہتی تھی اور ایسے میں ایک ہفتے بعد ہی دوبارہ آؤ میر گاؤں آیا تو سب کو حیرت ہوئی مگر اس دفعہ اس کے ساتھ ساجدہ آیا اور ان کے بچے بھی تھے ساجدہ آپا ملتان بیاہی گئی تھیں بچوں کی دسمبر کی چھٹیاں ہوئیں تو لاہور گھومنے چلے گئے مگر لاہور سے آؤ میر ان کو گاؤں لے آیا تھا کچھ دیر میں ہی پورے گھر میں رونق لگ گئی۔

”بچوں سے گھر بھر پڑا لگتا ہے۔ اللہ میری پارو کی گود ہری کرے۔“ اماں نے صدق دل سے دعا کی لیکن آؤ میر پہلو بدل کے رہ گیا تھا اور پارو اس دعا پہ جھک سی گئی مگر آؤ میر پہ نظر پڑتے ہی چند روز پہلے والی حیرت دوبارہ عود کے آئی تھی نہ جانے کیوں بچوں کو دیکھ کر اور ان کا ذکر سن کے اس کے چہرے کے زاویے بگڑ جاتے تھے ایک بے حد سرد و سپاٹ کیفیت پھیل جاتی تھی اور اس کی یہ کیفیت تین ماہ بعد اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔

”پارو.....“ وہ یکدم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دھاڑا۔ وہ گھبرا کر چلی ملک آؤ میر حیات دہکتی سرخ آنکھوں سے اسے ہی بھسم کر رہا تھا یقیناً وہ ابھی ابھی شہر سے آیا تھا اسے شہر گئے ہوئے بیس دن ہو چکے تھے اور یوں اچانک اس طرح غصے میں دیکھ کر وہ سچ بول کھا گئی تھی آخر پہلی بار وہ اسے اس طرح مخاطب کر رہا تھا۔

”کیا ہوا خیر تو ہے؟“ پارو نے تہ کئے ہوئے کپڑے بیڈ پہ رکھ دیئے۔

”میں اماں سے کچھ سن کے آ رہا ہوں کیا یہ سچ ہے؟“

وہ قریب آ کے پارو کے گداز بازو بوج چکا تھا۔ وہ اس کی اتنی سختی گرفت اور جارحانہ تیوروں سے الجھ گئی۔

”کیا سن کے آرہے ہیں؟“

”کہ تم پریکنیٹ ہو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا اور جواباً ایک سیکنڈ میں پارو کی پلکیں جھک گئیں کیونکہ یہی سچ تھا اور یہ سچ آؤمیر کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“ اس نے پارو کو یکدم جھنجھوٹ کے کہا اور وہ اس کے اس قدر وحشی پن سے تڑپ اٹھی تھی۔

”کیا پوچھ رہے ہیں؟“

”جو کچھ تم سن چکی ہو۔“

”اور جو کچھ آپ بھی سن چکے ہیں وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔“

”یعنی اماں کی بات سچ ہے۔“ وہ سختی سے بولا۔

”اماں جھوٹ کیوں بولیں گی؟“

”مگر مجھے یہ سچ گوارا نہیں۔“ آؤمیر کا سخت لہجہ انتہائی پتھر یلا لگ رہا تھا۔

”کیوں؟“ بے ساختہ پارو نے کیوں کا لفظ اٹھا دیا۔

”کیونکہ مجھے بچوں سے نفرت ہو چکی ہے میں بچوں کا وجود تو کیا ان کا نام بھی برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ بچوں کی وجہ سے رینا مجھ سے چھن گئی ان ہی بچوں کی خواہش نے میری ہم سفر میری ساتھی کو مجھ سے دور کر دیا اس بچے کے لئے اس نے اتنا صبر اور انتظار کیا تکلیف دیکھی اور یہی بچہ اس کی جان لے گیا موت کے منہ میں دھکیل دیا؟ پارو ایسا نہیں ہو سکتا اگر رینا نہیں مل سکتی تو یہ بچہ بھی مجھے منظور نہیں..... تمہیں چھکارا پانا ہوگا اس چکر سے۔“ ملک آؤمیر حیات نے پارو کے سر پہ ہم پھوڑ ڈالے تھے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

(رینا کے لئے بچوں سے نفرت؟) اس کے لئے حیرت پہ قابو پانا مشکل ہو چکا تھا دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے اس وقت تو وہ جواباً کچھ نہ کہہ سکی مگر جب رات کو دوبارہ آؤمیر نے وہی قصہ دوبارہ چھیڑا تو وہ چپ نہ رہ سکی۔

”وہ مر گئی ہے تو اس کے لئے آپ خود کیوں نہیں مرجاتے کسی اور کا قتل کیوں کروا رہے ہیں؟“

”میں کوئی بکواس نہیں مننا چاہتا تمہیں ہر قیمت پر میری بات ماننی ہوگی اس لئے سچ تمہیں میرے ساتھ شہر جانا ہوگا۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ڈبیا اور لائٹس سائڈ ٹیبل پہ پٹخ دیئے۔

”آپ کے ساتھ جاتی ہے میری.....“ اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ سو رہا تھا جب پارو نے رورو کر اپنی داستان اماں کے گوش گزار کر ڈالی تھی اور اماں نے دو تھپڑ مارتے ہوئے اپنا سینہ پیٹ ڈالا تھا۔

”ہائے میں مرجاواں اپنی نسل ختم کرنا چاہتا ہے ہمارا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے ہائے ملک جی کدھر گئے؟“

وہ واویلا کر رہی تھیں وہ سو کر اٹھا تو گھر میں جیسے ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ سکا اور جب سمجھ آیا تو اس کا بھی دماغ گھوم گیا تھا۔

”بس اماں بہت ہو گیا میں شروع دن سے آپ کی یہ زیادتیاں سہتا آیا ہوں آپ نے ہمیشہ اپنی بہن اور بھانجی کی فکر کی، کبھی میرا احساس نہیں کیا ہمیشہ آپ کو اپنی اس جاہل گنوار اور بدتمیز بھانجی کی پروا ہوتی تھی آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں میرا بھی دل ارمان رکھتا ہے، میرا بھی دل چاہتا تھا مجھے پڑھی لکھی یا ادب اور تمیز دار بیوی ملے لیکن آپ نے زبردستی متکئی کر کے دم لیا میں خاموش رہا لیکن جب ریتا کو لے کر آیا تو کیا تماشا لگوا یا تھا، آپ نے مجھے بیوی سمیت گھر سے نکال دیا۔ بے شک میں نے یہ قدم آپ کے خلاف اٹھایا تھا لیکن لوگ اولاد کو معاف بھی تو کر دیتے ہیں مگر آپ پ بہن کی بیٹی کا بھوت سوار تھا اور آپ کا یہی بھوت اور آپ سب کی آہیں اسے موت کے گھاٹ اتار گئیں، وہ تو وہ میرے پاس اس کی اولاد بھی نہ رہی اس کی جیتی جاگتی نشانی بھی مٹ گئی میرے ارمان جلا کر آپ اپنے ارمان پورے کرنا چاہتی ہیں ہونہہ ایسا کبھی نہیں ہوگا بلکہ وہ بھی نہیں سکتا اسے اگر میری بیوی بن کے اس گھر میں رہتا ہے تو میری بات ماننی ہوگی ورنہ طلاق دینا میرے لئے مشکل نہیں ہوگا۔“

وہ قہر آلود لہجے میں کہتا پلٹ کر اندر چلا گیا وہ دونوں دم بخود بیٹھی تھیں۔

بات ملک ضمیر حیات تک جا پہنچی تھی انہوں نے آثر میر کو بلایا دونوں باپ بیٹا نجما نے کتنی دیر بحث و فکر میں گھر رہے دونوں آگ بگولا ہو رہے تھے لیکن جب دونوں بیٹھک سے باہر نکلے دونوں ہی چپ تھے۔ چپ خاصی گہری اور پرسوج تھی اس لئے کسی نے بھی مداخلت نہیں کی مگر تنہائی میں اس نے پار کو ایک بار متوجہ ضرور کیا تھا۔

”تم نے جو کرنا تھا کر لیا تمہیں اماں اب کی شہ حاصل ہے لیکن ماہ پیکر بیگم اتنا یاد رکھنا آج کے بعد تمہیں میری بیوی نہیں اس بچے کی ماں بن کے رہنا ہے، میرا اور تمہارا تعلق صرف لوگوں کی نظروں تک ہے اور کہیں نہیں اور ہاں اپنے بچے کی ولدیت کے خانے میں تو تم میرا نام لکھ دو گی مگر میرے دل میں اپنے بچے کا نام کبھی نہیں لکھ سکو گی بلکہ اس کوشش میں تم اپنا آپ مٹا چکی ہو۔“

شہر جانے سے پہلے جو کچھ اس نے کہا تھا پار کو اچھی طرح یاد تھا اور سچ سچ آثر میر پہلے سے زیادہ دور اور اجنبی ہوتا گیا تھا گزرنے والا وقت اس کی اجنبیت اور بیگانگی میں اضافہ کر رہا تھا۔

پارو کے ہاں دو جڑواں بیٹے ہوئے تھے جن کی خوشی سنبھالنے نہیں سنبھل رہی تھی۔ پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی جا رہی تھی، بچوں کا اور پارو کا صدقہ بھی دیا تھا، آج قمر النساء اور فخر النساء دونوں بہنوں کے پاؤں زمین پہ نہیں رک رہے تھے خاندان بھر سے مبارک دینے کے لئے عورتیں آ رہی تھیں۔ گھر میں گہما گہمی تھی لیکن اس سارے ہنگامے میں صرف آثر میر حیات کی کمی تھی جس کو جڑواں بیٹوں کی اطلاع ملی مگر پھر بھی دل میں نرم نرم پیار یا احساس نے کوئی ہلچل نہیں مچائی تھی اور انتہائی سنجیدگی اور لا پرواہی سے اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا دیا تھا۔

”اماں! آثر میر نہیں آیا؟“ ساجدہ آپا نے چپکے سے استفسار کیا۔

”نہیں۔“ انہوں نے لا پرواہی سے کہتے ہوئے مٹھائی ٹرے میں رکھ کے اوپر جالی دار کپڑا اوڑھا دیا۔

”آپ نے بتایا تھا اسے؟“

”دیکھ ساجدہ مجھ سے باتیں نہ کر۔ ہم نے بتانا تھا بتا دیا اب وہ نہیں آنا چاہتا تو نہ آئے میں اپنے پوتوں کی خوشی اس کی فکروں میں لگ کے

خراب نہیں کرنا چاہتی.....“

”ہائیں؟“ ساجدہ کو حیرت ہوئی اماں کے انداز ہی بدل گئے تھے۔

”اماں یہ آپ کے پوتے بھی تو اسی کے بیٹے ہیں۔“

”بس بس مجھے سبق نہ پڑھا جانتی ہوں اسی بے غیرت کے بیٹے ہیں پر اس جیسے نہیں ہیں کبھی؟“ اماں نے لے کر باہر چلی گئیں۔

اماں تو بیٹے کی طرف سے بے فکری ہو گئی تھیں لیکن ساجدہ آپا سے ایسا نہیں ہو رہا تھا انہوں نے اپنے شوہر کو بلوایا اور آٹھ مہینوں کے آنے کا اصرار کیا تھا یہ بہنوئی کا لحاظ اور مروت ہی تھا کہ اس نے آنے کی ہامی بھری اور شام ڈھلے وہ گھر آ گیا تھا۔ ماہین جو آٹھ مہینے اتنے اہم موقع پہ غیر موجودگی سے بے پناہ خوش تھی یکدم بجھ سی گئی۔ پارونے دونوں بچوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر جیسے ان سے عزم لیا تھا پھر چہرے پہ کلائی رکھ کے لیٹ گئی۔



”ملک صاحب آپ کی چائے۔“ پارو کی کھٹکتی آواز پہ وہ بری طرح چونکا اور پلٹ کر دیکھا وہ کپ اس کی سمت بڑھا رہی تھی۔ چہرے پہ دلکشی بکھری تھی جلد کی چمک دمک میں اضافہ ہو چکا تھا ماتھے پہ تیوری کے بجائے ہونٹوں کی سرخیوں میں مسکراہٹ رچی ہوئی تھی۔ وہ بچوں کی پیدائش کے بعد پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا اسے پانچ چھ دن ہو چکے تھے آئے ہوئے لیکن ایک بار بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا تھا، آج اس نے سرین سے چائے بنانے کا کہا اور خود چھت پہ آ گیا تھا مگر چائے پارو لے کر آئے گی وہ بھی اتنے فریش اور دل جلا دینے والے انداز میں اسے امید نہ تھی۔

”ملک صاحب یہ چھت ہے کج (کچھ) شرم کرو۔“ اس نے جان بوجھ کے اسے چھیڑا اور آٹھ مہینے کے چہرے پہ غصے کی لالی اترنے لگی۔

”جانتا ہوں یہ چھت ہے لیکن تم شاید بھول رہی ہو کہ یہ چھت ہے اپنا علیہ دیکھا ہے۔“ وہ برہم ہوا پارو کا دوپٹہ سر کا ہوا تھا اور موٹی چوٹی آگے جھول رہی تھی۔

”میرا حلیہ تو صرف آپ کے سامنے ہے ملک صاحب اور میں شادی شدہ بال بچے دار بھی ہوں پر آپ کی چیخیری بہن تو کنواری ہے اس کے خلیے دیکھے ہیں کبھی؟..... چلتی ہوں اب۔“ وہ ابروؤں سے اشارہ دے کر پلٹی اور چوٹی کو گھما کے پیچھے اچھالا جو سیدھی آٹھ مہینے کے چہرے پر پڑی اور اس کے ہاتھ میں پکڑا کپ بھی ہل کے رہ گیا تھا وہ اس حملے سے سنبھلا تو نظر سیدھی ماہین پہ گئی جو کن اکیوں سے ادھر ہی متوجہ تھی۔ آٹھ مہینے پارو کی حرکت پہ تلملا اٹھا تھا لیکن وہ نیچے جا چکی تھی۔

”اس وقت چائے کیوں پی رہے ہیں؟“ ماہین قریب آ گئی دونوں گھروں کی چھتیں جڑی ہوئی تھیں البتہ درمیان میں چھوٹی سی دیوار تھی ماہین اسی دیوار کے پاس آ کر تھی۔

”دن میں سو یا نہیں سرد در در رہا ہے۔“

”تو پارو سے کہتے نا۔ وہ سرد پادیتی۔“ ماہین نے تیل چھڑکا۔

”ہونہہ پارو۔“ وہ ہلکے سے یڑبڑایا۔

”ویسے بڑا پیار ہے پارو سے جب بھی یاد کرتی ہے آ جاتے ہو۔“ ماہین نے ایک اور تیر پھینکا۔ آڑ میر نے الجھن بھری نظروں سے ماہین کو دیکھا۔

”بھئی میرے سامنے تو ہمیشہ یہی ہوا ہے جب بھی پارو سے پوچھا آڑ میر کب آئے گا جواباً وہ کہتی ہے آج کل میں آ جائے گا اور سچ مچ تم آ جاتے ہو کہیں فون وغیرہ پہ پہلے سے طے تو نہیں کر لیتے؟“ ماہین کا انداز دلچسپی اور کچھ استہزاء لئے ہوئے تھا۔ آڑ میر کو ناگوار گزر رہا تھا۔

”ہو بھی سکتا ہے ویسے آپ اس وقت چھت پہ کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے تیکھے پن سے دریافت کیا تو ماہین ہلکے سے مسکرا دی۔

”تمہیں دیکھ کر آئی تھی، سوچا تھوڑی دیر تم سے باتیں ہی کر لوں نیچے تو ہر وقت پارو اور تائی کی گھوریاں ہی ختم نہیں ہوتیں.....“

ماہین کے بدلے بدلے تیور اور لب و لہجہ آڑ میر کو اچھا نہیں لگ رہا تھا اسی لئے بہت جلد خالی کپ ہاتھ میں لئے نیچے اتر گیا تھا جو بات ابھی تک آڑ میر نہیں سمجھ سکا تھا وہ بات پہلے روز ہی پارو نے چند سیکنڈز میں محسوس کر لی تھی۔ وہ خالی کپ برآمدے میں رکھی میز پر رکھ کے اندر آیا تو پارو کو اپنے بچوں کے ساتھ مصروف دیکھ کر دوبارہ کمرے سے نکل گیا اسے اس سارے ماحول سے ہی چڑھنے لگی تھی۔ کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جس سے تھوڑی دیر کے لئے دل کو سکون مل سکتا یا پھر دل بہلانے کا سامان ہو سکتا اسی لئے وہ واپس جانے کا سوچ رہا تھا۔



آج تاپنا پڑاری سے کچھ کاغذات لے کر آئے تھے شاید کسی زمین یا پھر مکان کے پیر تھے جو آ کر پارو کو دیئے۔ لیکن وہ پڑے دھور ہی تھی اس لئے کہہ دیا کہ رکھ دوں بعد میں سنبھال کے رکھ دوں گی مگر بتا کچے کام کرنے کے عادی نہیں تھے اس لئے تمام کاغذات آڑ میر کو تھما دیئے۔

”جاؤ تم ہی الماری میں رکھ آؤ اب میں کہاں ہاتھ میں پڑ کے بیٹھا رہوں۔“

مجبوراً آڑ میر کو اٹھنا پڑا اور اندر آ کر اپنی اور پارو کی مشترکہ الماری کھولی کاغذات رکھنے کے لئے اس نے مختلف خانے کھولے اور ایک میں اور بھی کاغذات دیکھ کر رک گیا تھا لیکن جو پیر آڑ میر کے ہاتھ لگے وہ اس کے لئے حیرت انگیز انکشاف سے کم نہیں تھے اس کی آنکھیں بے یقین تھیں۔

”پارو اور بی اے کی ڈگری؟ یہ میرے بھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے اپنی بصارت کو دھوکہ سمجھنا چاہا مگر ان پہ دستخط اور کالج کی مہر اس سچائی کا ثبوت پیش کر رہی تھیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سچ کو ماننے پہ مجبور ہو رہا تھا۔

”اوہ میرے خدا یا یعنی وہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ایسی اجڈ انوار بنی ہوئی ہے اس نے کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ بھی کچھ سمجھ بوجھ رکھتی ہے۔“

آڑ میر الماری بند کرتے ہوئے حیرت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیوانہ ہو رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا تو پارو کو صحن کے ایک کونے میں بندھی بکریوں کا دودھ نکالتے ہوئے دیکھا۔

آڑ میر کو یکدم دماغ چکراتا ہوا لگا وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا صحن میں نیچھی چار پائی پہ آ بیٹھا۔ پارو دودھ نکالنے کے بعد کچی مٹی کا برتن لے کر تین چار بلیوں کے آگے دودھ ڈال رہی تھی اور یہ یقیناً اس کا معمول تھا کیونکہ بلیوں کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس خوراک کی عادی ہیں ایک بلی کے ساتھ اس کے بچے بھی تھے دودھ پیتے ہوئے کافی خوش ہو رہے تھے اور پارو ان کو دیکھ کر خوش ہوتی رسوائی میں چلی گئی۔

”اماں دال کے ساتھ چاول بنالوں یا روٹیاں ہی ٹھیک ہیں؟“ اس نے اونچی آواز سے پوچھا اماں وضو کر کے نکلی تھیں۔
 ”پتر چاول تو ابھی کل کھائے تھے روٹیاں ہی بنالے۔“ اماں کی تھکی تھکی آواز آئی۔

آج وہ دوسرے گاؤں کی فونگی پہ اظہار تعزیت کے لئے گئی تھیں اس لئے مزاج دھیمّا ہی تھا۔ پارو نے رسوئی کے باہر برآمدے کے ستون کے قریب آٹا رکھا چنگیر اور آنے کی پرات رکھی دوپٹہ عام دیہاتی عورتوں کی طرح سر پہ باندھا اور آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔ صحن میں ایک دم خاموشی چھا گئی، صرف پرندوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آٹھ میر نے بے ارادہ ہی پارو کی سمت دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

چاندی کے گول گول جھمکے بار بار اس کے اناری رخساروں کو چھو کر سرشار ہو رہے تھے۔ آٹھ میر سچ محسوس ہو گیا تھا اس نے پارو کو ہر زاویے سے دیکھ ڈالا لیکن وہ لا پرواہی سے کام کرتی رہی۔

اماں گھر پہ نہیں تھیں اب اپنے کمرے میں لیٹے تھے پارو دونوں بچوں کو سلا کر خود نہانے چلی گئی ابھی اسے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ چھوٹے صاحبزادے نے رونا شروع کر دیا اور اتفاقاً آٹھ میر اسی وقت کمرے میں داخل ہوا تھا بچے کے رونے کی آواز پہ بے ساختہ گردن موڑ کے دیکھا، دونوں جھولے میں سو رہے تھے لیکن جھولا رکا ہوا تھا اور ایک بچہ رو رہا تھا اس نے کچھ دیر کر کر دیکھا اور سوچا کیا کیا جائے وہ آگے بڑھ کر اسے اٹھا لے یا پھر یونہی چھوڑ کر چلا جائے مگر فیصلہ ذرا سا مشکل تھا پھر بھی اس نے مشکل فیصلہ ہی کیا اور کمرے سے نکل جانا بہتر لگا جیسے ہی قدم واپسی کے لئے موڑے بے اختیار اپنی جگہ پر جم سے گئے اس کے رونے میں اضافہ ہو چکا تھا اور نہ جانے کیوں اس کے قدم جھولے کی سمت اٹھتے گئے قریب آ کر اس نے بچے کو اٹھا لیا اور پھر اپنے آپ کو اسے پیار کرنے سے نہ روک سکا تھا اسے گالوں پہ ہونٹوں پہ آنکھوں پہ پیشانی اور بالوں پہ والہانہ بوسے دیتا آٹھ میر اگلے پچھلے پیار کی شدت پوری کر رہا تھا اور بچہ روتے روتے اس قدر پیار اور شدت پہ سہم گیا تھا تب تک دوسرا بھی اپنے بھائی کی تقلید کر چکا تھا اور آٹھ میر دونوں کو بیک وقت بازوؤں میں لے کر بیڈ پہ آگیا دونوں بچے اس کے نین نقوش چرا کے لائے تھے۔ مکمل آٹھ میر کی تصویر تھے وہ ان کو دیکھتے ہوئے دل کھول کر مسکرایا اپنی شکل و صورت کی جھلک اتنی مشابہت اپنے بچوں میں دیکھنا سرشاری اور فخر سے کم نہیں تھا، وہ بے اختیار انہیں سامنے لٹائے پیار کئے جارہا تھا اور اندر داخل ہوتی پارو یہ منظر دیکھ کے ٹھٹھکی گئی تھی۔ اس نے مسکراہٹ روکی اور دبے قدموں سے واپس ہی پلٹ گئی۔

”اماں ادھر آ.....“ پارو پوڑھی میں داخل ہوتی اماں کو دیکھ کر بھاگ کر قریب آئی۔

”اللہ خیرے کرے کیا ہوا؟“

”اماں! آ کے اندر دیکھ کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے دبے قدموں اماں کو دروازے سے جھانکنے کا کہا۔ آٹھ میر اپنے بیٹے کے چھوٹے چھوٹے سرخ سفید ہاتھ چوم رہا تھا۔

”ہائیں؟“ وہ اُچھل پڑیں۔

”چپ اماں چپ۔“ پارو ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ ابابھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔

”ابا دھر آؤ۔“ پارو انہیں بھی کھینچ لائی ابا کی بھی آنکھیں کھل گئیں، آؤ میر نے دو ماہ بعد اپنے بیٹوں کو دیکھا تھا اس لئے پیار بھی دو ماہ کے حساب سے ہو رہا تھا۔

یونی ان کے ساتھ کھیتے کھیتے آؤ میر خود بھی سو گیا تھا اور شام تک وہ تینوں کافی سکون بھری نیند سوئے رہے۔ آؤ میر کی آنکھ کھلی تو پارو کو صوفے پر سوتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور ساتھ ہی کچھ قہقہے بھی ہوا دونوں بچے اس کے دائیں بائیں جو سو رہے تھے نفرت اور کوفت کا دور دور تک نام و نشان بھی نہیں تھا مگر پھر بھی اپنی بات پر قائم رہنے کا دکھاوا ضروری تھا اسی لئے پارو بے دار ہوئی تو اسے جھڑک دیا۔

”اس کمرے میں رہنا چاہتی ہو تو اپنے بچوں کو سنبھال کے رکھو، مجھے ہر وقت بچوں کا رونادھونا پسند نہیں ورنہ اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لو۔“ خفگی کا بھرپور اظہار کیا جا رہا تھا۔

”میں تو ٹھکانہ نہ کہتی ہوں مگر میرے شیر جوان کہتے ہیں اماں کبھی اپنی جگہ مت چھوڑنا لوگ قبضہ کر لیتے ہیں۔“ پارو غسل کر کے آئی تھی اس لئے ابھی تک بال کھلے تھے، گھنے سیاہ چمکدار بال چوٹی سے آزاد ہو کے اور زیادہ حسین لگ رہے تھے وہ اپنے بالوں کو سلجھاتی ہوئی ذرا اترا کے بولی تھی، آؤ میر اس کے قریب آ گیا اس نے پارو کو اپنے قریب کرنا چاہا مگر وہ چار قدم دور ہٹ گئی تھی۔

”نہیں ملک صاحب! آپ نے خود ہی کہا تھا میں آپ کی بیوی نہیں اب اپنے بچوں کی ماں بن کے رہوں گی میرا اور آپ کا تعلق صرف لوگوں کی نظروں تک ہے۔“

پارو کا یہ وار بھی بڑا کاری تھا۔ ”وہ تملکا کے رہ گیا تھا۔“

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارے قریب آنے کا۔“

”شوق تو بہت ہیں ملک صاحب۔“ اس نے مزید ہوا دی، آؤ میر نے غصے میں اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔

”تم آخر چاہتی کیا ہو؟“ اس نے غم کے پوچھا جواباً پارو کلائی کی تکلیف کے باوجود کھلکھلا اٹھی تھی اس کا دلکش قہقہہ آؤ میر کی رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش اور بڑھا گیا تھا۔

”آپ کو ترپانا چاہتی ہوں ملک صاحب کیونکہ آپ کی ترپ بڑی اچھی لگتی ہے مجھے، آپ ترپتے ہوئے بہت پیارے لگتے۔“ پارو آج سچ سچ اسے تیار ہی تھی۔ آؤ میر اس کی باتوں اور حرکتوں کے شکنجے میں آتا جا رہا تھا وہ جو پارو سے عمر بھر جنگ کرنا چاہتا تھا ہمیشہ دنگا فساد چاہتا تھا وہ ابھی سے اپنے ہتھیار ڈالنے لگا تھا اسے احساس ہو چکا تھا کہ جھگڑوں، نفرتوں اور کدورتوں میں کچھ نہیں رکھا زندگی، زندگی کا احساس اور زندگی کے سب رنگ صرف اور صرف محبتوں میں ہیں یہ محبتیں ہی ہیں جو انسان کو قدم قدم پہ روک کے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے سوچنے بچھنے اور ساتھ چلنے والوں کی قدر کرنا سکھاتی ہیں۔۔۔۔۔ پارو کو بغور دیکھتے ہوئے غصے اور خفگی کے باوجود آؤ میر نے اسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔

اور پہلی بار آؤ میر کے لمس میں محبت کی نرمیاں اور مہک محسوس کر کے بے اختیار پارو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ نوجوانی میں قدم رکھتے ہی اس کی محبت گلے لگا بیٹھی تھی اور اس محبت کو دل میں دبائے ہوئے اس نے نجانے کون کون سے نشتر کھائے تھے، پہلے ٹھکرائے جانا پھر اس کی بے

رخی ناقدری پھر غصہ اور نفرت بھی دیکھنا پڑے تھے اور اس سب کے ساتھ اپنے آس پاس کے لوگوں کو مطمئن بھی رکھنا کہ میں بہت خوش ہوں کافی حوصلہ طلب کام تھے پھر بھی وہ کرتی آئی تھی، اس پہ یہ احساس بھی کہ وہ اسے نہیں رینا کو چاہتا ہے اور رینا کی چاہت میں اسے اپنے بچوں کی بھی پرواہ نہیں تھی، وہ اولاد جیسی نعمت سے بھی منہ موڑنے کو تیار تھا لیکن پارو کے لئے یہ نعمت محبت کا سب سے پہلا اور انمول تحفہ تھی اس لئے وہ آؤ میر سے نکر لینے پہ تیار ہو گئی تھی اور آج جب اسی نعمت اسی تحفے کو آؤ میر نے گلے لگا لیا تھا وہ روح تک شانت ہو گئی تھی اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی محبت اور اس کی متاجیت گئی ہے اسی لئے ہزاروں شکوے ہونے کے باوجود بھی وہ مطمئن اور پرسکون تھی لیکن پھر بھی چند موتی ایسے بے تاب تھے جو آؤ میر کے سینے کو بھگو گئے تھے۔

”پارو تم بہت اچھی ہو۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھنسا کر اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ وہ بہت مدہم آواز سے رورہی تھی۔

”میں بہت پہلے سے تمہارا دیوانہ تھا شاید تب سے جب تمہیں پہلی بار پارو کہا تھا یا پھر تب سے جب جب تمہیں میرے پاس آنا اور میرے ساتھ کھیلنا بھی پسند نہیں تھا جب تمہیں بولنا بھی نہیں آتا تھا میں ہمیشہ تمہاری طرف لپکتا تھا اور تم ہمیشہ مجھ سے دور بھاگتی تھیں تمہارا رویہ ایسا ہی رہا تو میں اپنے آپ کو روکنے لگا میرا تمہاری طرف لپکتا نہ ہونے لگا اور ربیحہ کی شادی پہ تو میں سچ مجھ میں دل سے نکال بیٹھا تھا۔

تم نے اپنی سہیلیوں کے سامنے مجھے بے قدر اور غیر اہم کر دیا تھا بلکہ میری توہین میں ذرا کسر نہیں چھوڑی تھی تب میرا دل تمہارے خلاف ہونے لگا میں نے مسئلے سے انکار کر دیا لیکن اماں باز نہیں آئیں اور میں انگلینڈ جانے کے بعد بھی تمہارا توہین آمیز انداز نہیں بھول پایا تھا اس لئے رینا کی ذرا سی توجہ بھی محبت لگنے لگی اور اپنے احساسات کو بھی محبت کا پہناوا پہنایا لیکن درحقیقت میں تم سے بدلہ لے رہا تھا اسی لئے تو اچانک ہی رینا کو ساتھ لے آیا تھا تا کہ تمہیں پتہ چلے کہ میرے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے تم اکڑو کھاؤ گی تو میرے لئے ہزاروں تیار ہوں گی، لیکن ان ہزاروں میں تم نہیں ہو گی میں یہ بھی جانتا تھا اور پھر رفتہ رفتہ مجھے رینا سے اپنائیت اور انسیت ہونے لگی وہ میرے لئے اتنی خوبصورت جگہ اتنے اچھے دوست اتنی پرکشش جاب اور اپنا فوج چھوڑ آئی تھی اس کی کینز کرنا اس کے ساتھ نباہ کرنا میرا فرض تھا جو میں پورا کرتا رہا کبھی کبھی رینا کو تمہاری بہت فکر ہوتی تھی وہ تمہارا سوچ کر شرمندہ بھی ہوتی تھی لیکن میں نے کبھی اسے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔

ان ہی دنوں میں اس کی پریکٹسی کا پتہ چلا ہم حقیقتاً بہت خوش تھے مگر جب جب اماں آتا اور تمہارا خیال آتا میں بہت بوجھل ہو جاتا تھا اور وہ اپنی جگہ پہ محرم بن جاتی تھی شاید اسی لئے بہت جلد سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔

پارو تمہارا مقام اپنی جگہ مگر رینا بھی میرے لئے بہت محترم ہے میں اس کا احسان مند ہوں اس نے میرا قدم قدم پہ خیال رکھا میرا احساس کیا ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جب اماں نے دوبارہ شادی کا ذکر چھیڑ دیا جو مجھے اچھا نہ لگا اور پھر اماں کا تمہارے لئے اتنا پیار مجھے چڑھنے لگا کہ تمہاری کیفیات اتنی عجیب تھیں کہ مجھے ہر چیز سے بے زاری ہونے لگی تھی۔

میں سمجھتا تھا اماں خواہ مخواہ تم سے اتنی محبت کرتی ہیں حالانکہ تمہیں کسی کی محبت کی کوئی پرواہ نہیں ہاں اگر تھوڑی سی بھی محبت اماں آتا ہے رینا کو دی ہوتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی پہلے روز ہی اسے گھر سے نکال دینا مجھے بُرا لگا تھا اسی لیے مجھے تم سے ہیر ہو گیا لیکن یہ بیر کب تک چل سکتا تھا شادی کے

بعد تمہیں جتنا اپنے پاس دیکھتا میری سالوں سے پرورش پاتی محبت اتنی ہی جاگتی تھی اسی لئے زیادہ تر شہر میں ہی رہتا تھا تاکہ تمہیں بھی کچھ سبق چکھا سکوں مگر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا تم نے میری توجہ کی لگا میں کھینچتا شروع کر دی تھیں، میں قدم قدم پہ ڈگمگایا اور پھر ایک روز سچ جی ڈگمگایا.....

پارو تم یقین کرو ہمیشہ تمہارے پاس آ کر میں نے اپنے آپ سے جنگ کی ہے، بہت مارا تمہاری محبت کو لیکن سچ کہتے ہیں محبت مرنے نہیں سکتی یہ صرف مارنے کے فن جانتی ہے، مرناس کی تقدیر نہیں کیونکہ محبت ایک بے وجود چیز ہے اور ہمیشہ وہی چیز مرنے کا کوئی وجود ہوتا ہے محبت کا وجود نہیں اس لئے وہ مرنے نہیں سکتی وہ صرف روح ہے نظر نہ آ کر بھی اپنا آپ منوانے والی اور ہمیشہ وہی چیز فتح حاصل کرتی ہے جو نہ ہو کر بھی سب کچھ ہوتی ہے اور تمہاری محبت بھی میرے لئے سب کچھ تھی۔

اسی لئے آج فتح پا چکی ہے مجھے سچ بچوں سے جڑ ہو چکی تھی ایک بچے کو تخلیق کرنے کی خاطر رہنا جان سے گزر گئی۔ اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ تم بھی اس تکلیف سے گزرو شاید میں اندر سے خوف زدہ ہو چکا تھا لیکن ان بچوں کو دیکھ کر میرے سارے خوف مٹ گئے ہیں بلکہ میرے کئی اور خدشات بھی ختم ہو گئے ہیں۔

میرے سینے میں سوئے ہوئے جذبات ان کی معصوم محبت نے جھنجھوڑ کے رکھ دیئے ہیں۔ میں نے آج ان کے سامنے اپنے سارے ہتھیار پھینک دیئے ہیں اور آج میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں پلیز مجھے معاف کر دو، میں نے ہمیشہ تمہیں ستانے کے لئے تمہیں انور کیا تمہاری محبت دل میں دبائے رکھی۔“ آج اس نے حال دل صاف کہہ سنایا تھا اور پارو روتے روتے بے اختیار مسکرا دی۔ آؤ میرے اپنے سینے پہ سر رکھے مسکراتی ہوئی پارو کو حیرت سے دیکھا جو ابھی بھی آنسو بہا رہی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے وجہ پوچھی۔

”ملک صاحب اگر آپ نے میری محبت اپنے دل میں دبا کے رکھی تھی تو کونسا میں نے آپ کی محبت ختم کر دی تھی میں نے تو اس سے بھی زیادہ دبائی ہوئی تھی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ حیران ہوا.....

”کچی پوچھو ملک صاحب اتم رہیجہ باجی کی شادی کے موقع پر بہت اچھے لگے تھے اور بقول شنو مجھے تم سے بہت پیار ہو گیا ہے۔ اسی لئے تو میں نے بھی ڈگری لی ہے آخر تم جو پڑھے لکھے تھے۔“

”کیا؟“ آؤ میرے بدک گیا تھا۔

”پارو اور پیار؟ نہیں نہیں یہ سراسر جھوٹ ہے۔“ وہ سر جھٹکنے لگا اور پارو اظہار کرنے کے بعد مطمئن کھڑی تھی۔

”جھوٹ بول رہی ہونا؟“

”اللہ سونے دی قسم ملک صاحب آنکھوں سے دل تک اور دل سے زبان تک سچ ہے۔“

”لیکن میں نہیں مان سکتا۔“

”ماں لو فائدے میں رہو گے۔“ وہ اسے چھیڑنے لگی۔ آؤ میرے یقین تھا۔

”اچھا ادھر آؤ.....“ اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا پارو ذرا جھکی پھر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ اس نے پارو کو قریب کر لیا۔ وہ ابھی ابھی نظروں سے دیکھنے لگی، کچھ بول ہی نہ پائی۔

”اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ تم میری ہی پارو۔“ وہ مزید پھیلنے لگا تو پارو نے بھاگنے کا سوچا لیکن اب بھاگنا اتنا آسان بھی نہیں تھا ساری دوڑیں تو وہ اسے خود تھا چکی تھی۔



پاک، سو سائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

**For more details kindly visit
<http://www.paksociety.com>**